اردو کی منتخب ادبی تواریخ: تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ

یونیورسٹی آف میسور مانسا گنگوتری

میں

پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا

مقالہ نگار

حجاز لطیف سی۔ سی۔ او

نگران

پروفیسر یس۔ مسعود سراج

سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس و صدر

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف میسور

یونیورسٹی آف میسور، میسور

2019

URDU KI MUNTAKHAB ZAKHEEM ADABI TAWAREEKH

TAHQEEQI-O-TANQEEDI JAEZA

THESIS

Submitted to University of Mysore in fulfillment of the requirements

For the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

HIJAS LATHEEF C.C.O

Under the Supervision of

Dr. S. MASOOD SIRAJ
Former Dean faculty of Arts and Chairman
Department of Studies in Urdu

DEPARTMENT OF STUDIES IN URDU
UNIVERSITY OF MYSORE, MYSORE

2019

فہرست

پیش لفظ

مجھے طالبِ علمی کے زمانے سے تاریخ سے دلچسپی رہی ہے۔بچپن سے بزرگوں کی زندگی کے واقعات سنتے سنتے دل تاریخ کی طرف مائل ہوتا گیا۔میں نے ڈگری تک پہنچتے پہنچتے بہت سے بزرگوں کے تذکرے اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرڈالا۔جب ایم۔اے میں داخلہ لیا اور تاریخ ادب کو باقاعدہ طور پر پڑھنے کا موقع ملا۔تو مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہماری ادب کی تاریخیں اپ ڈیٹ Update)) نہیں ہوئی ہیں۔

اردو زبان و ادب کی بہت سی تاریخیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان تمام ادبی تایخوں کے مطالعے سے ان کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض خامیوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔مختلف تاریخ ادب کی کتابوں میں ایک ہی واقعہ کے مختلف بیانات ملتے ہیں۔اس سے حقیقت کی تہہ تک پہنچنے اور اصل واقعے کا پتا لگانے میں دشواری ہوتی ہے۔اایک ہی واقعے کے بارے میں مختلف تاریخوں میں سنین کا اختلاف بھی باعث پریشانی ہوتا ہے۔لہٰذا ادبی تاریخوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لینا ناگزیر ہے۔اسی جذبہ واحساس نے مجھے اس موضوع کے انتخاب پر مائل کیا۔یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر تا حال جس قدر کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔مختلف مورخین نے ادبی تاریخیں مختلف انداز سے لکھی ہیں۔اردو شعر و ادب کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔سب سے پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ تقسیمِ ابواب کی ترتیب کس طرح ہو۔مختلف ادوار کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ادب کی تاریخ میں زبان کی تاریخ کو بھی شامل کیا جانا چاہیے یا نہیں۔کیونکہ لسانیات اور ادب دو علٰیحدہ چیزیں ہیں۔مورخ کی یہ بھی کوشش ہونی چاہیے کہ کسی بھی عہد کا کوئی اہم شاعر یا ادیب چھوٹنے نہ پائے۔اور نہ کوئی صنف ادب تذکرہ سے محروم رہ

جائے۔مورخین کوسنین پیدائش و وفات دیتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے اور اپنے ماخذ کی تفصیل دینی چاہیے۔ ایک اور سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ میں کسی بھی مصنف کی حیات کا کتنا حصہ ہو اور اس کے کارناموں کے جائزے کا کتنا حصہ ہو۔بعض مورخین حیات کی تفصیل تو دیتے ہیں لیکن کارناموں کا جائزہ اختصار سے لیتے ہیں۔بعض حیات پر زیادہ توجہ نہیں دیتے ان کی توجہ تصانیف کے نقد وتبصرے پر رہتی ہے۔ اگر چہ ادبی تاریخ میں تحقیقی پہلو جتنا اہم ہوتا ہے اسی قدر اہم تنقیدی پہلو بھی ہوتا ہے۔کسی کے بارے میں تنقیدی رائے تو آسانی سے قائم کر لی جاسکتی ہے۔مگر تحقیقی تسامحات کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے اس کے لیے ثانوی نہیں بنیادی ماخذ کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ادبی تاریخوں میں موجودہ تحقیق کی روشنی میں پائے جانے والے تسامحات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مورخین ادب کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے حدود میں رہ کر جو کچھ کیا ہے وہ ایک کارنامے سے کم نہیں۔تاہم تسامحات،تسامحات ہیں۔انھیں دور کرنا بھی ضروری ہے۔ جو غلط مفروضات قائم کر لیے گئے ہیں ان کی تصحیح بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر تا حال زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ادبی تاریخ نگاری کا جائزہ لینا ایک آسان کام نہیں ۔اس میں مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہیں۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر منقسم ہے۔

پہلا باب تاریخ اور ادبی تاریخ کے نظری مباحث سے متعلق ہے۔جس میں تاریخ اور ادبی تاریخ کی تعریف ان کی اہمیت وافادیت پر مشرقی اور مغربی دانشوروں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ادبی تاریخ نگاری کے مقاصد اور تقاضوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ادبی تاریخ کا ایک اہم فریضہ ماضی کے ادب پاروں کی فنی تفہیم اور تعیین قدر ہے۔ادبی تاریخ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ادبی تاریخ کے زیر نظر

تین زمانے ایک ہوجاتے ہیں، یعنی ماضی، حال اور مستقبل۔اب تک کی لکھی گئی اکثر ادبی تاریخیں ایک مخصوص عہد کا احاطہ کرتی رہتی ہیں۔اب بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے اندازفکر کے ساتھ ایک نئی تاریخ ادب مرتب کی جائے۔

دوسرے باب میں اردو میں ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش یعنی تذکروں کا تعارف اس روایت کی ابتدااورخصوصیات نیز تذکروں میں تاریخِ ادب کی موجودہ خصوصیات وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔تذکرہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں شعراء کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام کا انتخاب دیا جاتا ہے۔تذکرے میں صرف شعراء کے حالات ہی بیان کیے جاتے تھے،نثر نگاروں کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔شعراء کی ترتیب عموماً حروف تہجی کے اعتبار سے دی جاتی ہے۔تاہم بعض تذکرہ نویسیوں نے ادوار بھی قائم کیے ہیں۔اردوادب کی تاریخ میں تذکروں کی بڑی اہمیت ہے۔اردو نے جہاں دوسری اصناف میں عربی وفارسی روایت کی پیروی کی ہے وہیں اس نے اردو میں تذکرہ نویسی کا رواج فارسی کے اثر سے شروع کیا۔اردو تذکرہ نگاروں نے فارسی کے تذکروں سے نہ صرف انداز بیان اور پیش کش کا طریقہ فارسی سے لیا، بلکہ اکثر تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔اردو کا پہلا تذکرہ نکات الشعرا ہے۔اس کے علاوہ میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو، مصحفی کا تذکرہ ہندی، قائم کا مخزن نکات، علی لطف کا گلشن ہند، قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغزم شیفتہ کا گلشن بے خار قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام تذکرے ایک ہی نہج پر لکھے گئے ہیں۔ان میں شاعر کے واقعات حیات، شخصیت اور نمونہ کلام کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔تذکرے اختصار کے باوجود بڑے معلومات افزا ہیں۔اس باب میں ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں آب حیات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔محمد حسین آزاد

کی آب حیات کو اردو کی پہلی ادبی تاریخ کہا جا سکتا ہے جو 1880ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کا موضوع اردو زبان کا تدریجی ارتقاء اور اردو شاعری کا ولی سے لے کر انیس تک یعنی سترہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک کی شاعری کے تاریخی" تہذیبی فنی اور ارتقا کا محاکمہ ہے۔ اگرچہ آزاد کے عہد تک فنی شعور کا تجزیۂ فن اور فن کار کا رشتہ، ادب اور زندگی کا رشتہ، فن کار اس عہد کے سیاسی وسماجی اثرات وغیرہ موضوع بحث نہ تھے۔ تاہم اردو ادب کی تاریخ میں آب حیات کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لسانی اعتبار سے اردو زبان کے آغاز کے متعلق آزاد کی رائے سے اتفاق ممکن نہیں۔ شعراء کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ محمد حسین آزاد ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے علمی اصولوں کی روشنی میں موضوع کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں انھوں نے قدیم تذکروں سے استفادہ کیا ہے وہیں با قاعدہ مآخذ تاریخ نیز زندہ راویوں کے سہارے روایتوں کو قلم بند کرنے کی سعی کی ہے۔ پہلی بار اردو ادب میں انھیں کی بدولت فن کار کے سوانح اور فن کار اور اس کے فن کا رشتہ استوار نظر آیا۔ انھیں کی وجہ سے شعراء کے فن پر اظہار رائے کے لیے بعض اصطلاحات کو وسعت ملی۔ شعراء کی سنہ پیدائش، وفات، سوانح اور کسی عہد کے تاریخی وفنی پس منظر کو اہمیت حاصل ہوئی۔ آب حیات اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے۔ آزاد اپنے اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

چوتھا باب اردو کی ادبی تاریخوں کے اجمالی جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو ادب کی اہم ادبی تاریخوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ آب حیات کے بعد با قاعدہ ادبی تاریخ 1927ء میں رام بابو سکسینہ نے لکھی۔ اس تاریخ ادب کا انداز تمام ماسبق تالیفات سے مختلف اور جداگانہ ہے۔، اگرچہ سکسینہ درس و تدریس کا تجربہ نہیں رکھتے تھے مگر وہ وقت کی ضرورت کو

پہچانتے تھے۔تاریخ ادب کے مزاج شناس تھے۔اردو، فارسی اور انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے یہ کتاب اساتذہ، طالب علموں اور ادب کے شائقین کے لیے لکھی۔اس کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے اردو زبان میں کیا۔اس انداز سے کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی ترجمہ کا مطالعہ کررہے ہیں۔مرزا محمد عسکری ترجمہ کرتے ہوئے اصل کے ساتھ ماخذ اور معیار کی طرف بھی توجہ دی ہے۔اپنی معلومات اور مشاہدات کام میں لاکر کتاب میں ضروری اضافے بھی کیے ہیں۔یہاں سے ادبی تاریخ نگاری کا رواج عام ہونے لگا۔بہت سی چھوٹی اور بڑی ادبی تاریخیں منظر عام پر آنے لگیں۔ان میں احسن مارہروی کی تاریخ نثر اردو، آغا محمد باقر کی تاریخ نظم ونثر، ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو، حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اردو قابل ذکر ہیں۔اس باب میں ان تمام اہم ادبی تاریخوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب میں اردو کی چار اہم منتخب ضخیم ادبی تواریخ یعنی علی گڑھ تاریخ ادب اردو، جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو، سیدہ جعفر کی تاریخ ادب اردو اور وہاب اشرفی کی تاریخ ادب اردو کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد 1962ء میں منظر عام پر آئی۔یہ ایک اجتماعی کارنامہ ہے۔اس میں نذیر احمد، نجیب اشرف، محمد مجیب، عبدالقادر سروری، سید محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، مسعود حسین خان جیسے محققین کے مضامین شامل ہیں۔اس میں سنین کے بہت سارے تسامحات پائے جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے اس کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی۔ پھر بھی اس کے اچھے پہلوؤں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔اس میں گراں قدر معلومات ملتی ہیں۔

جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو، اب تک کی لکھی گئی ادبی تاریخوں مین سب سے

زیادہ مستند اور معتبر تاریخ ہے۔شعراء کے حالات بعض جگہ طویل نظر آتے ہیں۔جمیل جالبی نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو آج تک بڑی بڑی اکاڈمیاں اور بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکے۔جس قدر مخطوطے، تذکرے، تصانیف کے حوالے اس تاریخ میں ملتے ہیں کہیں اور نہیں ملتے۔اس اعتبار سے یہ تاریخ بہت ہی ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

سیدہ جعفر کی تاریخ ادب اردو عہد میر سے شروع ہوتی ہے ترقی پسند تحریک اور معاصر شعراء پر اختتام کو پہنچتی ہے۔سیدہ جعفر نے شعراء کے فن اور ان کے کلام پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔شعراء کے کلام کے محاسن کی طرف اشارہ ہی نہیں کیا بلکہ شعراء کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

وہاب اشرفی کی تاریخ ادب اردو ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک کے شعراء اور ادیبوں کا احاطہ کرتی ہے۔یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے تمہید میں ادبی تاریخ نگاری کے اصولوں پر تفصیلی ظہار خیال کیا ہے، جو ادبی تاریخ لکھنے والوں کے لیے بے حد کار آمد ہیں۔

ماحصل میں اس مقالے کے تمام ابواب کے اہم نکات کو پیش کیا گیا ہے۔

میں حسب ذیل اداروں اور کتب خانوں کے اراکین منتظمین کا شکر گزار ہے جنھوں نے اپنے کتب خانوں کے مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

میسور یونیورسٹی لائبریری، میسور

مدراس یونیورسٹی لائبریری، مدراس

خدابخش لائبریری، پٹنہ

ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد

کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

کتب خانہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی۔

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔اس کے بعد میں سب سے زیادہ ممنون ومتشکر میرے مشفق رہنماو رہبر پروفیسر یس مسعود سراج کا ہوں جن کی حوصلہ افزائی، دلجوئی اور دلچسپی کے بغیر یہ مشکل کام انجام تک پہنچنا ممکنات میں سے نہ تھا۔ان کی سرپرستی اور تعاون کے بغیر میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ، خواب ہی رہ جاتا۔ ہر مشکل گھڑی میں انھوں نے میری تالیف قلب کے لیے جو کچھ کہا اس سے مجھ میں ایک نیا عزم وحوصلہ پیدا ہوا۔میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ کیرلا کے ایک قصبہ میں ملازمت کرتے ہوئے، جہاں لوگ ملیالم کا استعمال کرتے ہیں، مجھ جیسے مبتدی کے لیے تاریخ ادب جیسے وسیع موضوع پر کام کرنا اتنا آسان نہیں پھر بھی میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کروں۔

میں شعبہ اردو کی صدر پرتبھا مدلیار، ڈاکٹر سید عتیق الرحمٰن، ڈاکٹر بلال احمد اور تمام دوست واحباب کا شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا، اور ہر قدم پر میرا تعاون فرمایا۔

حجاز لطیف

ادبی تاریخ نگاری: مفہوم، مقاصد اور تقاضے

تاریخ حقائق کی بازیافت کا علم ہے۔ گزشتہ ادوار اور نسلِ انسانی کے تجربات کا خاکہ اسی علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی وحدت کا نام ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے زمانہ حال میں ماضی کے واقعات اور حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے۔ پھر عہدِ گزشتہ کی غلطیوں اور خامیوں سے سبق سیکھ کر آنے والے کل کو زیادہ بہتر، محفوظ اور خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔

تاریخ ہمارے ذہنی وفکری، جذباتی وتہذیبی، معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے جس کے آئینے میں قومی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کوئی قوم یا ملک کس طرح کے انقلابات سے دو چار ہو کر اور کن کن نشیب وفراز سے گزر کر اپنی ترقی کے موجودہ ادوار تک پہنچا۔ ان تمام حقائق سے ہم تاریخ ہی کی بدولت آگاہ ہوتے ہیں اور یوں اپنی ذات کے عرفان کے ساتھ ساتھ قومی تشخص کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ بقول مولانا شاہ ابوالحسن ادیب:

> تاریخ کا مطالعہ ایسا ہے جس سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال کے واقعات انسان کے نظروں میں آجاتے ہیں اور وہ مختلف قوموں اور مختلف طبقوں اور مختلف زمانوں کے لوگوں کے ساتھ ملاقات کرتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا اور حالات دیکھتا ہے۔ یہی علم ایسا ہے جسے ماضی اور حال میں تسلسل قائم ہوتا ہے اور استقبال کی راہ راست مل جاتی ہیں۔ (1)

تاریخ کا مطلب اور مفہوم بیان کرنے کے لیے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ مُروّج ہیں جن کا مطلب یہی بنتا ہے کہ جو واقعہ ماضی کا حصہ بن جائے۔ اُس تک پہنچنے کے لیے تحقیق اور تدوین کا بیان تاریخ ہے۔ اگرچہ اردو میں تاریخ کا لفظ متعدد معنوں میں مستعمل ہے لیکن ہم حقائق کی بازیافت کے جس علم کی بات کر رہے ہیں اس کے حوالے سے اردو میں لفظ

تاریخ کا وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو انگریزی لفظ History کا ہے۔ گویا یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے متبادل ہیں۔ تاریخ کا لفظ بنیادی طور پر عربی کا لفظ ہے۔ متعدد معنوی جہتوں میں اس کی نمایاں ترین معنی واقعات کی زمانی ترتیب اور اس کے بیان سے متعلق ہے۔ جہاں تک انگریزی لفظ History کا تعلق ہے۔ لاطینی لفظ Histo یا Historia سے مشتق ہے۔ جس سے مراد کسی واقعے کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔ عام طور پر لفظ ہسٹری سے مراد کسی قوم، معاشرے اور ادارے کے وقائع خاص کا صحتِ وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں تاریخ کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

"Study that traditionally has aimed at providing an overall explaination of the process of history" (2)

یعنی گذرے ہوئے واقعات کا صحت اور محنت کے ساتھ بیان تاریخ کہلاتا ہے۔

دانشوروں نے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ ڈچ مورخ جی۔ ہوزنگ (G.huizing) تاریخ کی تعریف یوں کی ہے:

''تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس سے ماضی کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔'' (3)

''برطانوی فلاسفر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) تاریخ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''تاریخ صرف اس بات کا جواب ہے کہ اس کائنات میں واقعات کیسے رونما ہوئے۔'' (4)

(ڈاکٹر صادق علی گل، سرگذشت تاریخ، ص:33)

اسی طرح بیسویں صدی کا مشہور مورخ ٹائن بی (Arnold J Toynbee) کے

مطابق تاریخ حقائق کی تحقیق اور ان کو ضابطہ تحریر میں لانے کا فن ہے۔ ان تعریفوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی مؤرخین اسے ایک ہمہ جہت علم سمجھتے ہیں جو زندگی کے ہر پہلو کو محیط کیا ہے اور زندگی کے ہر رنگ کے حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ اس کا مطالعہ انسان کو پہچاننے کے لیے ہے کیونکہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو سمجھے اور فطرت کو جانے تبھی ترقی کے مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔

ابن خلدون دنیا کے مایہ ناز مورخ ہیں۔ انھوں نے تاریخ نویسی کے علم کو ایک مستقل حیثیت عطا کی۔ اور ان کی مشہور کتاب مقدمہ آج بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اپنی کتاب میں انھوں نے تاریخ کی تعریف یوں کی ہے:

''علم تاریخ ایک معزز و بلند پایہ بہت فائدوں والا علم ہے۔ کیونکہ یہ ہمیں گزشتہ اقوام کے اخلاق واحوال بتاتا ہے۔'' (5)

مولانا شبلی نعمانی علم تاریخ کی تعریف اور اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' آج دنیا میں جو تمدّن، معاشرت، خیالات اور مذاہب موجود ہیں سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں۔ اس گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گزشتہ واقعہ سے کیوں کر پیدا ہوا اسی کا نام تاریخ ہے۔'' (6)

تاریخ ماضی کی دستاویز ہے۔ اس میں واقعات وحقائق کو ہو بہو تحریر کیا جاتا ہے۔ یعنی تاریخ ماضی کے واقعات کو تاریخی تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس میں عہدِ رفتہ کے واقعات کی تفصیلات کو معروضی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ بقول ایچر بام

''History is a special method of studying the present with the aid of the facts of the past.''(7)

تاریخ ماضی کے حقائق کی روشنی میں حال کا مطالعہ کرنے کا ایک خصوصی طریقہ کار ہے۔ اس اعتبار سے تاریخ ماضی کے ان حقائق کو سامنے لاتی ہے۔ جو عہد حاضر کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

بقول پروفیسر اے ایل راؤ سے:

"History is essentially the record of the life of men in societies in their geographical and their physical environments. Their social and cultural environments arises from the interaction of the one with the other, the society and its geographical condition". (8)

ای۔ ایچ کار تاریخ کے متعلق یوں رقم طراز ہے:

"History consists essentially in seeing the past through the eyes of present and in the light of its problems, and that the main work of the historian is not to record bur to evaluatefor, if we does not evaluate how can we know what is worth recording". (9)

تاریخ بنیادی طور پر ماضی کو حال کی نگاہوں سے دیکھنے کا عمل ہے۔ اور اس کا مطالعہ اس کے اپنے مسائل کی روشنی میں ہو۔ مورخ کا اہم کام یہ نہیں کہ وہ صرف واقعات و بیانات کو جمع کرے بلکہ اسکی تعینِ قدر بھی کرے۔ اگر وہ تعینِ قدر نہیں کرتا ہے تو وہ کیسے معلوم کر سکے گا کہ کون سا مواد قابلِ اندراج ہے۔

تاریخ کو بیان کرنے کے کچھ پیمانے اور تقاضے ہیں۔ کیوں کہ تاریخ نویسی محض گذرے ہوئے واقعات کی جمع بندی نہیں ہوتی بلکہ تاریخ نویسی، فکری، فنی تقاضے رکھتی ہے۔

تاریخ نویسی کی بابت معروف تاریخ نویس اور محقق ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں :

> ''تاریخ نویسی میں تین عناصر کی اہمیت ہے اوّل واقعات، دوم اِن واقعات کو جانچنے پرکھنے کی شہادت اور سوئم اِن واقعات کے بارے میں مورخ کی تنقید، تفسیر یا تاویل۔ کیونکہ محض واقعات کو سَن وار بیان کرنے سے تاریخ کی اہمیت واضح نہیں ہوتی اور نہ ہی اِس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔'' (10)

تاریخ محض واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں سماجی و معاشی اور ثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔کوئی قوم یا سماج ایک خاص دور میں کس طرح گزر کرتا تھا، ان کے خیالات کیسے تھے۔ان کی رسومات کیا تھیں ادبی نظریات کیا تھیں۔ ان تمام باتوں سے روشناس کرنے کے لیے تاریخ کا سہارا لینا پڑھتی ہے۔اور تاریخ واحد علم ہے جو ماضی کے تمام جذبات و واقعات، مشاہدات اور مواد کے خزانوں کو اپنے دامنِ پیکر اس میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔تاریخ کا دامن بے حد وسیع ہے۔اس کے مطالعے کا دائرہ کسی خاص دور تک محدود نہیں اور نہ یہ انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی ایک مخصوص گوشے سے وابستہ ہے۔

ادب کی روایتی تعریف یہ ہے کہ یہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور انسانی فطرت کا مطالعہ ہے۔ادب سے مراد ایسی تحریریں ہیں جو انسانی ذہن کے لیے تسکین کا باعث بنے۔اور یہ تحریریں ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں زندگی کے تجربات اور حقائق رونما ہوتے ہیں۔ کسی خاص دور کا ادب اس دور کی معاشرتی زندگی ترجمانی کرتا ہے۔اس دور کی سوچ، مزاج، تہذیب اور سیاسی وسماجی زندگی کی بھرپور عکاسی ادبی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ ولیم ہنری ہڈسن (William Henry Hudson) نے ادب کی تعریف اس طرح کی ہے۔

> "Literature is a vital record of what men have been in life, what they have experienced of it,

what they have thought and felt about those aspects of it which have the most immediate an expression of life through the medium of language."(11)

(An Introduction to the study of literature, William Henry Hudson, Page no.(10)

ادب کی تعریف یوں کی ہے :Encyclopedia Britannica

Abody of written works. The name has traditionally been applied to those imaginative works of poetry and prose distinguished by the intentions of their authors and the perceived aesthetic excellence of their execution. (12)

زندگی اور ادب براہ راست ایک دوسرے سے منسلک ہیں ۔ زندگی ہو یا کہ ادب دونوں کا مفہوم اپنے معنی میں ایک بحرِ بے کنار ہے جس میں اختلاف رائے کے لاتعداد جزیرے ہیں ۔اور ان کی متفقہ تعریف ناممکن ہے ۔ ادب کے بنیادی ستون ''خیال کی پرواز'' اور'' زبان پر گرفت'' ہیں ۔ ادب کسی قوم اور کسی زبان کی پوری تہذیب اور مزاج کا اظہار ہوتا ہے ۔ڈاکٹر سید عبداللہ ادب کی ایک معنی خیز تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ادب ایک فن لطیف ہے ۔جس کا موضوع زندگی ہے ۔ اس کا مقدمہ اظہار، ترجمانی وتنقید ہے، اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے، اس کا معاون اظہار خیال اور قوت مخترعہ ہے اور اس کی روپ وہ حسین ہیئت اور وہ خوب صورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں ۔ اس فن لطیف میں اظہار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اور یہی چیز اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے ورنہ شدت تاثر اور تخیل کی مصوری اور تخلیق و اختراع کا عمل دوسرے

فنون میں بھی ہے۔''   (13)

ادب دراصل زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے، وہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کی ایک ایسا نقشہ ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس میں تاریخی حقیقت زندگی کا سچا تصوراورفن کے صحیح احساس کا ہونا ضروری ہے۔ ادب کی درست تعین قدر کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ادب کا زندگی سے کتنا تعلق ہے وہ کہاں تک زندگی کے صحیح مفہوم کو پیش کرتا ہے اور ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ادب زندی اور اس کے تجربات کو سمجھنے کا عور بخشتا ہے۔ اور نئے تھربات کے لیے اہم معلومات بہم پہنچا تا ہے۔

ادب ہمیشہ نظریات کا پابند رہا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ادب کے نظریات میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ افلاطون سے لے کر جدید تحریکات تک، ادب کسی نہ کسی صورت میں نظریات کا پابند رہا ہے۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون نے ادب یا فنون لطیفہ کو نقل در نقل کہا گیا ہے۔ ان کی مشہور ومعروف کتاب ''ریاست'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں المیہ نگاروں یا دوسرے نقل کنندگان کی قوم کے بارے میں اپنے الفاظ دہرانا نہیں چاہتا لیکن مجھے تمہیں یہ بتلانے میں عار نہیں ہے کہ تمام شاعرانہ نقلیں سامع9ین کے لیے ضرر رساں ہیں ان ا/ سک فطرت کا علم ہی ان کا سد باب کر سکتا ہے''   (14)

یوں تو لوگ ادب کو ہمیشہ کسی نہ کسی نظریات کے تحت پرکھتے ہیں۔ لیکن ادب ہمیشہ آزاد رہا ہے۔ اس کی تخلیقی عمل میں ایک آزاد اور کھلی ہوئی فضا کی ضرورت ہے جہاں اس کے تخیل کی پرواز کو محدود کرنے والی کوئی چیز نہ ہو جہاں وہ اپنے جذبات، مشاہدات اور محسوسات

کوجس طرح چاہیے پیش کرے۔ادب کوکسی فلسفہ کا غلام بنا دینے میں اس کی ادبیت اورافادیت دونوں مجروح ہوتی ہیں۔ پھر بھی ادب اپنے خالق کی نظریات کا پابند ضرور ہوتا ہے لیکن اس پابندی سے اس کی افادیت پرکوئی آنچ نہیں آتی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''بیرونی حیثیت سے ادب زندگی کے کسی نقطہ نظر کا جو (ادیب کا نقطہ نظر ہوتا ہے)
پابند بن جاتا ہے اور اندرونی حیثیت سے ان قوانین فن کا جو مخصوص قسم کے ادبی
اظہار کے لیے وجود میں آتے ہیں اس لیے اچھا ادیب وہ ہوگا جو اپنے نظریے اورفن
دونوں سے وفاداری برتے۔ جولوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ ادب کی
حقیقت سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں'' (15)

ادب اورسماج کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہے۔ادب کا ڈھانچہ زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی سیاسی،سماجی،معاشی اورفنی لوازمات سے تیار ہوتا ہے۔اردو ادب کے مشہور نقاد مجنون گورکھ پوری کا خیال یہ ہے کہ ادب سماج کا تابع ہے۔

'' ادب انسان کے جذبات وخیالات کا ترجمان ہے، اور انسان کے جذبات و
خیالات تابع ہوتے ہیں زمانے اور ماحول کے، جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی
ویسے ہی جذبات وخیالات ہونگے۔اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔'' (16)

بہترین ادب کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی خواہشات کی تکمیل کرے ،ہر شخص کواس کے ذوق اور معیار کے مطابق ذہنی سکون پہنچائے اوراچھے خیالات وصحت بخش تصورات پیش کرے۔ یہ بات اس وقت ہوسکتی ہے جب ادب اپنے سماجی ماحول ،تہذیبی ، اخلاقی اورمعاشرتی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔

ادب کا خمیر زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی سیاسی،سماجی،معاشی اورفنی لوازمات سے تیار ہوتا ہے۔اس لیے ادبی تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کسی بھی زبان اوراس کے

بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ادب میں مختلف فکری، تہذیبی، سیاسی، سماجی اور لسانی عوامل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ادبی تاریخ میں ان تمام اثرات، روایات، محرکات، خیالات اور رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے۔ نیز ادبی تاریخ ایک ایسی اکائی ہے جسے منقسم نہیں کیا جاسکتا۔

کسی بھی عہد کے ادب کو سمجھنے کے لیے اس سے ماقبل عہد کے ادب کو سمجھنا ضروری ہے۔ مورخِ ادب، شعراء وادبا کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ ایک زندہ نقش ابھر آئے اور جس سے ادب کی رفتار اور ترقی کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے مورخِ ادب ادبی تاریخ کو سماجی وتہذیبی ارتقا کی روشنی میں پرکھتا ہے۔

تاریخ سے ادب کا رشتہ یہ ہے کہ دونوں انسانی زندگی کا عکس ہے۔ ادبی تاریخ دراصل تاریخ کا ایک شعبہ ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی اصلی صورت نظر آتی ہے۔ کیونکہ ادبی تاریخ جذبوں اور احساسات کی تاریخ ہے۔ اسی کے ذریعے ہم انسان کی نفسیات اور خواہشات کو سمجھ سکتے ہیں۔

ادب کی تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کسی بھی زبان وادب کے ارتقا کی پوری داستان دکھائی دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ یوں ادب اور زندگی سے بیک وقت دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ادب کی تاریخ بھی ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں۔

> ''یادگار کارناموں کا الفاظ میں مقید کر کے انسان مطمئن ہوگیا تو تخلیق کو لفظ کی مہک دے کر امر ہوگیا۔ تاریخ ادب لفظ اور تخلیق کی اس مہک کی طرف توجہ دلانے کے فن کا نام ہے۔ اس لیے تاریخ کے اشتراک کے باوجود کسی ملک کی

تاریخ اوراس کے ادب کی تاریخ میں خاافرق ہوتا ہے‘‘ (17)

ادبی تاریخ، کسی خطے میں بسنے والے لوگوں کی پہچان ہوتی ہے۔ادبی تاریخ کسی بھی خطے اورقوم کی مجموعی یادداشت کا خزانہ ہوتی ہے۔ادبی تاریخ کے بارے میں محض یہ کہنا کہ یہ ماضی کی روایات، حالات، واقعات کوکسی قصے کے انداز میں بیان کرتی ہے یہ ادبی تاریخ کا غیر واضح پہلو ہے۔حقیقت میں ادبی تاریخ ماضی کے واقعات، حالات، رجحانات، دانش اورعلم کو جاننے کا نام ہے جہاں سے کسی بھی خطے کے اجتماعی شعور کا پتہ چلتا ہے تاریخ کے اِسی شعور سے ہی کسی خطے میں بسنے والی قوم کی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادبی تاریخ کے حوالے سے بیسویں صدی کے جرمن مورخ رینے ویلیک (Rene Wellek) کا نام بے حد مشہور ہے۔اس نے ادبی تاریخ نگاری پر وضاحت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کے مطابق کچھ لوگ ادب کوصرف قومی یا سوشل تاریخ کی دستاویز سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ادب کوصرف ادب ہی خیال کرتے ہیں۔ رینے ویلیک کے مطابق ادب کی بیشتر مستند تاریخیں یا تو تہذیبی تاریخیں ہیں یا پھر تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں جن میں خیالات اور نظریات کو پیش کیا جاتا ہے۔اس کے مطابق کسی عہد کی ادبی تاریخ لکھتے ہوئے اس اس عہد کے تمام ادبی لوگوں کے آپس میں ادبی وسماجی تعلق کوضرور سمجھنا چاہیے۔علاوہ ازیں متعلقہ ادوار کے ادب پاروں کو بذاتِ خود مطالعہ کرنا بہت اہم ہے۔تاکہ ان کی اہمیت کو سمجھنے اورحیثیت کو متعین کرنے میں آسانی ہوسکے۔اس کے ساتھ ساتھ متعلقہ ادوار میں مشابہت رکھنے والے خیالات نیز متوازی اورمخالف رو کے خیالات کو سمجھنا، پرکھنا اوران کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ایک اوراہم نقاد اورمورخ ڈبلو۔پی۔کیر (W.P. Ker) ادبی تاریخ کوایک میوزیم سے تشبیہہ دیتا ہے۔جس طرح ایک میوزیم میں گزرتے وقت کے شاہ کار

ایک خاص ترتیب وتنظیم سے سجائے جاتے ہیں تا کہ ماضی کو ان کی ترتیب کی مدد سے سمجھا جا سکے۔ یہ شاہ کار مختلف زمانوں یا ادوار سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی منفرد حیثیت اور الگ وجود بھی رکھتے ہیں اسی طرح ادبی تاریخ میں بھی عہد گزشتہ کے ادبی شاہکاروں کا تعارف کرایا جاتا ہے جو اپنی اپنی جگہ علٰحیدہ شناخت اور منفرد زندہ وجود بھی رکھتے ہیں۔ اور ایک مربوط روایت کی صورت نظر نہ آئے تو اس کی حیثیت بے کار ثابت ہوگی۔ اسی وجہ سے کیر(W.P.Ker) ادبی تاریخ کو ایک میوزیم سے تشبیہہ دیا ہے۔

> "Literary history is like a museum, and a museum may be of use even if ill arranged, the separate specimen may be studied by themselves". (18)

ادبی تاریخ نویسی کے اصول ومبادیات، ادبی تاریخوں کے مقدمات، دیباچوں، تنقیدی، تحقیقی مضامین اور مقالات کی جانب دیکھتے ہیں۔

> "It is true that a nations literature made up of the works of individual writers,nd that for the ordinary purpose of study these writers may be detached for there Surroundings and treated separately. But we can not a history of such literature unless and until each one has be put into his place in the sequence of things and consider with reference to that great body of literary production which is work must know be regarded as a part". (19)

کسی بھی قوم کا اَدب یقیناً وہاں کے ادیبوں کی انفرادی کاوِشوں کا ثمر ہوتا ہے۔ اور

مجموعی سطح کے مطالعے کے لیے ان ادباء کی نگارشات کا انفرادی سطح پر الگ سے مطالعہ اور جائزہ ممکن ہے تاہم کسی قوم کی اَدبی تاریخ کا مُرتب کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام قابلِ ذکر اَدبی فن پاروں اور مُصنفین کو اُن کے صحیح حالات کے تناظر اور تاریخی تسلسل کے پس منظر میں سے نہ دیکھا جائے جس وجہ سے اَدب تخلیق ہوا۔

> "Historians treat literature as document for the illustration of national or social history, those constituting another group recognize that literature is first and foremost an Art, but appear unable to write history. They present us with a discontinuous series of essays on individual authors, attempting to link them by influences but lacking any conception of real historical evolution". (20)

جبکہ کچھ تاریخ دان ادب کو قومی یا سماجی تاریخ کی وضاحت اور اس کی عملی شکل دکھانے والی دستاویز کے طور پر لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسے گروپ کی تشکیل کرتے ہیں جو اَدب کو بنیادی طور پر فنونِ لطیفہ میں سے ایک سمجھتا ہے اور اِسی لیے تاریخ نویسی کو اس کے دائرے سے باہر سمجھتا ہے اس حوالے سے مُصنفین کے بہت سارے مضامین پیش کرتے ہیں جن میں تاریخی حقائق کو مربوط کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر حقیقی تاریخی ارتقاء کا کوئی تصور نہیں اُبھرتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو روح انسان کی فکر کے یہ تانے بانے کہاں سے آتے ہیں اور کیسے بنتے جُڑتے ہیں۔ یہاں الگ الگ اجزاء کی تشکیل کو جاننے کی کوشش کرنا تاریخ ہے۔ جبکہ اِس تمام کو ایک مُکمل اِکائی کی صورت میں دیکھنے کا نام اَدب ہے۔

ادبی تاریخ نویسی، عہد بہ عہد روایت کے عمل، رجحانات، نظریات، شاعروں، تخلیق

کاروں کے حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی تخلیقات کے مواد کا تحقیقی، تنقیدی جائزہ ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اَدب میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اَدبی تاریخ اُن تبدیلیوں کا اَثر لیتی ہے یعنی اَدب میں ہونے والی تبدیلیوں کا اثر، دراصل کسی بھی خطے میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی طور پر تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتا ہے مثلاً شعری ونثری پیرائیہ اِظہار میں تبدیلی، موضوعات میں تبدیلی، اصناف کی ہیئت میں تبدیلی، حقیقت میں سماج میں ہونے والی تبدیلی کے زیرِ اثر ہوتی ہے اِسی تبدیلی کا اثر تاریخ ادب کی بُنیاد بنتا ہے اَدبی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے جو کہ مورخ کی تاریخی بصیرت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اپنے ایک مضمون ''اَدبی تاریخ کی تشکیل کے مسائل'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک اچھی تاریخ ادب وہ شخص نہیں لکھ سکتا جو صرف محقق ہو اور نہ ہی تاریخ ادب کی تصنیف کسی ایسے شخص کا کام ہے جو صرف نقاد ہو۔ اچھی تاریخ ادب صرف وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو بیک وقت تحقیق اور تنقید پر قدرت رکھتا ہو۔'' (21)

تحقیق اور تنقید، اگر چہ ادبی تاریخ کے دو اہم پہلو ہیں۔ ادبی مورخ کے لیئے تحقیقی و تنقیدی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے محض ادبی تحقیق، ادبی تاریخ کو حالات وواقعات کے بیان کا تحقیق نامہ بنا دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی محض تنقید، ادبی تاریخ کو تنقیدی مضامین کا مجموعہ بنا سکتی ہے۔ تاریخ ادب محض شاعروں، ادیبوں کی سوانح عمری کا مجموعہ نہیں ہوتی اور نہ ہی فن پاروں کا بستہ ہوتی ہے بلکہ تاریخ اَدب، بیک وقت ادب، اسلوب، تخلیق کار اور معاشرے کی عکاس ہوتی ہے جس سے تاریخ، تہذیب کے گہرے شعور اور سماج کے تعلق کی وضاحت ہوتی ہے اِسی تناظر میں محقق ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ''ادبی تاریخ کو نہ تو محض سوانحی مجموعہ ہونا چاہیے۔ نہ ہی تنقیدی مضامین کا مجموعہ،

اور نہ ہی اسے سماجی تاریخ بننا چاہیے۔ اسے ادب کا مسلسل ارتقاء پیش کرنا

چاہیے۔جس میں غیر ادبی عوامل کی حیثیت ثانوی رہنی چاہیے۔'' (22)

تحقیق، حق کی تلاش کا نام ہے اور ہر تحقیقی عمل مسلمہ، مصدقہ اور متفقہ ہوتا ہے۔ اس لیے محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ حق کی تلاش میں سچ کا ساتھ دے اور اس کی تنقید میں توازن ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ میں ایک تسلسل ہونا ضروری ہے تاریخ ادب میں واقعات میں تبدیلی رونما ہو تو پھر تبدیلی کے عمل کو دکھانا ضروری ہے جس سے پہلے سے موجود واقعات اور ادبی حالات کی حقیقت میں تبدیل ہونے والے منظر نامے میں ایک تعلق سامنے آئے گا۔ ایسے مسلسل عمل کو جس میں تبدیلی نظر آئے اسے ارتقاء کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا لفظ ماضی کا ارتقاء کہلاتا ہے۔ اور اس عمل میں معاشرتی اقدار، ماحول، تخلیق کار، معاشرے میں تبدیلی کا سبب بنتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''تاریخ ادب پڑھتے ہوئے یہ بات محسوس ہونی چاہیے کہ جہاں مخصوص واقعات اور رجحانات شخصیات کو جنم دیتے ہیں وہیں اَدبی شخصیات بھی واقعات اور رجحان کو جنم دے کر تاریخ کے دھارے کو نئی جہت دیتے ہیں زندگی میں جو حرکت اور عمل نظر آتا ہے اُس کی واضح جھلک اَدبی تاریخ میں نظر آنی چاہیے۔'' (23)

ادبی تاریخ کو سب سے پہلے تاریخ ہونا چاہیے۔ اس میں صحیح سنین دینے پر خاص توجہ کرنی چاہیے۔ کسی مصنف کا سنہ ولادت، سنہ وفات اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات مثلاً ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کی تاریخیں دینی چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کی مختلف تصانیف اور اس کے اہم ایڈیشنوں کے سال بھی زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ دئے جائیں۔ اگر تخلیق کہیں اور سے ماخوذ ہے تو اس کے ماخذ اور مختلف تراجم کی نشاندہی بھی کی جائے۔ ادبی

تاریخ میں یہ طے کرنا ہوگا کہ کسی ادیب اورادب پارے کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔اورمختلف سیاسی ،سماجی ،علمی اوردوسرے ادواروں نے کسی ادیب یاتخلیق پرکیااثر ڈالا ہے۔ادبی اصناف کے ارتقا،ادبی تحریکات کے عروج وزوال بھی نمایاں کرنا ہوگا۔گویاادبی تاریخ کا تہذیبی تاریخ اورتاریخ افکار کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرنا بہتر ہے۔ادب سماج اورتہذیب کا اہم جزو ہے،اس لیے اسے انسانوں کی تہذیبی اور ذہنی تاریخ سے علاحدہ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ادب میں ہونے والی تبدیلیاں،سماجی اورتہذیبی سطح پر تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔اس تبدیلی کے بارے میں سوالات کے جواب مؤرخ کو دینے چاہئیں۔ڈاکٹر گیان چندؔ لکھتے ہیں:

''اس میں،میں اضافہ کرتا ہوں کہ ادبی مؤرخ کو جواب ضرور دینا چاہیے کہ ایک تخلیق،ایک خاص صنف میں کیوں تخلیق ہوئی؟ جب وہ اس بات کا جواب دے گا تو اس کا واسطہ،اُس تہذیب سے ضرور پڑے گا جس میں وہ صِنف وجود میں آئی۔'' (24)

ادبی تاریخ میں ایسے سوالات،تہذیبی شعور کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ شعور،ادبی تخلیقات،اصنافِ ادب اورزبان وبیان میں ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ کسی تخلیق کار نے اپنے عہد کو کیا دیا؟ اُس کی تخلیقات کا معیار کیا ہے؟ ادبِ عالیہ میں اُس کا مقام اورمرتبہ کیا ہے؟ یوں ادبی تاریخ میں ایک تخلیق کار کے کردار کو اس کی تخلیقات کی روشنی میں،معاشرتی اور تاریخی تناظر میں دیکھا جائے گا۔

تاریخ،حقائق کو بیان کرنے کا نام ہے جس میں مآخذات بنیاد ہوتے ہیں۔اَدبی مؤرخ اَدب کی تاریخ میں جو کچھ بیان کرتا ہے اُس کے لیے وہ مآخذ پیش کرتا ہے اور تحقیق کی بنیاد پر وہ کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔اَدبی تاریخ نویسی کے عمل میں تمام حقائق،حوالے اور سند کے

ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ثانوی آخذات کی بجائے بنیادی آخذات کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے داخلی وخارجی تنقید کے اصولوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

داخلی تنقید کی مدد سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ جو کچھ مصنف نے لکھا ہے اُس کا مطلب اور معنی کیا ہیں؟ یوں داخلی تنقید کی مدد سے کسی دستاویز، تحریر یا کتاب سے اس میں موجود حقائق کا تعین کیا جاتا ہے کیوں کہ حقائق کا تعین کرنا داخلی تنقید کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ بنیادی آخذ یا سند اگر نہ مِل سکے تو پھر دیگر تصانیف غیر مطبوعہ مواد کو شامل کرنا ضروری ہے۔

خارجی تنقید میں دستاویز، مخطوطے یا مسودے کی جانچ پڑتال سے اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ اَصل دستاویز کہاں سے مِلی۔ اُس کی ہیئت مختلف ادوار میں کیسی تھی۔ اُس دستاویز کا کوئی حصہ، اُس کی سیاہی کیسے تھی؟ اور کس دور کی تھی؟ اِس کے علاوہ اس دور کی لفظیات اور اُس دستاویز میں برتی گئی زبان کا استعمال کیسا تھا؟ یوں خارجی تنقید ایک ایسا عمل ہے جس کے نتیجے میں مؤرخ کسی دستاویز کی غلطیوں کو دور کرتا ہے جس کی تصدیق یا تردید کے لیئے وہ خارجی لوازمات کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تحقیق ایک جامع انداز کا تقاضا کرتی ہے۔ادبی تحقیق یا موضوعاتی تحقیق میں تین متناسب پہلو، اَدبی تحقیق ،تنقید، فلسفہ وفکر، تجزیہ ومطالعہ شامل ہوتے ہیں۔ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''اَدبی تحقیق'' کے دوشعبے ہیں:

1۔ سوانحی اور تاریخی تحقیق 2۔ تدوین متن

اَدبی تاریخ کے لیے سوانحی تحقیق اور اَدبی تنقید مرکزی شعبے ہیں۔'' (25)

تحقیق کا اوّل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اَدبی کتابوں، مخطوطوں و دیگر ذرائع سے جو مواد

میسر ہو وہاں سے زیادہ سے زیادہ معلومات لی جائیں اور غلط معلومات کی درستی کی جائے تا کہ اَدبی تاریخ میں غلط مواد شامل نہ ہو۔ یُوں تحقیق میں قدیم شُعراء، ادیبوں کے بارے میں ترتیب وتدوین اور تذکرے وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اَدبی تاریخ نویسی کے ضمن میں ادوار کے تعین اور اصنافِ اَدب کی تقسیم کے حوالے سے مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ ظفر الاحسن لاری لکھتے ہیں:

''ہمارے ادبی مورخین نے نہ صرف نظم اور نثر کو علیحدہ کر کے ایک دوسرے سے بے تعلق کر دیا ہے بلکہ اس کے علاوہ نثر میں ناول اور ڈراما وغیرہ کی الگ الگ شاخیں کھڑی کر دی ہیں۔ یوں نظم میں غزل، قصیدے، مثنوی اور مرثیے وغیرہ کو الگ الگ تقسیم کرتے گئے۔'' (26)

جبکہ ادبی تاریخ میں ادوار بندی کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ادبی تاریخ میں ادب کے مختلف ادوار کی صرف خصوصیات بیان کرنے کا تصور پرانا ہو چکا ہے ادبی تاریخ کو سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے مختلف انداز کے بہاؤ میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔'' (27)

ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے ادوار اور اصناف کی تقسیم کے بارے میں مختلف محققین، مورخین اور ناقدین کی رائے مختلف ہے اور کوئی حتمی طریق کار طے شدہ نہیں ہے۔ جیسے اردو ادب میں کہیں مقامی طور پر حد بندی ہے مثلاً دکن میں اردو، پنجاب میں اردو اور کہیں یہ حد بندی زمانی اعتبار سے ہے مثلاً متقدمین، متوسطین، متاخرین وغیرہ جیسی تقسیم موجود ہے۔ اس کے علاوہ اصناف کے حوالے سے مرثیہ، ناول، ڈراما، انشائیہ، افسانہ وغیرہ یا پھر دبستانی تقسیم مثلاً دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ دلی، دبستانِ ملتان وغیرہ۔ اس تناظر میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

''مختصر لفظوں میں ہمارے اَدوار کا تعلق، قومی تاریخ کے ادوار سے کُلیۃً آزاد نہیں

ہوسکتا۔‘‘ (28)

ادبی تاریخ کے اِس پہلو سے ہمیں اور بھی بہت سی مثالیں مِل جاتی ہیں۔ کیوں کہ ادب کی تاریخ، کسی قوم کی اجتماعی تہذیب، سیاست، معاشرت کے مختلف طرح کے سفر کی کہانی ہوتی ہے۔ جس میں ہر دور کے فکری، تاریخی اور دیگر عوامل کے اثرات موجود ہوتے ہیں کسی بھی قوم کے ادب کی تاریخ کے پیچھے مختلف ادوار کے ساتھ بہت سے قومی نوعیت کے سوال جڑے ہوتے ہیں۔ اور مورخ اِن مختلف اَدوار میں پیدا ہونے والے سوالات اور دیگر تبدیلیوں کے بارے میں جواب دیتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں تبدیلی واضح نظر آئے وہاں سے نیا دور الگ سے بتانا چاہیے۔

ادبی تواریخ میں ادوار کی تقسیم کے حوالے سے انگریزی اَدب کی تاریخ، شاہی ادوار کے نام سے منسوب دکھائی دیتی ہے۔ جیسے الزبتھ عہد، وِکٹوریہ عہد وغیرہ۔ جبکہ عربی دب میں یہ تقسیم ذہنی اور فکری انداز میں ملتی ہے مثلاً جاہلی دور کا ادب یا اموی، عباسی دور کا ادب وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب میں ادوار کی تقسیم کے سلسلے میں کوئی حتمی اصول کارفرما نہیں ملتا۔

ادبی تاریخ مہینے، سال کی گردش سے الگ نہیں ہوتی۔ کسی شاعر، ادیب کی پیدائش، وفات، کتاب کی اشاعت کا سال یا کوئی اور ادبی تاریخی واقعہ، تاریخ، دِن اور سن وار درج کیا جاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے اس اصول کا تقاضا ہے کہ سنین کا اندراج تحقیق کے اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے اور اِس بات کا طے ہونا ضروری ہے کہ یہ اندراج اسلامی مہینے کے مطابق ہو یا انگریزی مہینے کی تاریخ کے مطابق۔ یعنی ایک کلینڈر کا اِنتخاب ہونا چاہیے۔

ادبی تاریخ کیسے لکھی جانی چاہیے؟ اِس کا اندازِ بیاں، اسلوب کیسا ہونا چاہیے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہیں جن کے بارے جاننا ضروری ہے کیا ادبی تاریخ کا بیانیہ مقفع مسجع عبارت کا عمدہ

نمونہ ہونا چاہیے؟ اِس کے اندازِ بیان میں تنقیدی پیمانہ کس طرح کا ہونا چاہیے؟ مؤرخ کی تنقیدی بصیرت کیسے ہونی چاہیے؟ وہ ادب پارے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کس طرح سے کرسکتا ہے۔ اس تناظر میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔ایک سادہ تاریخ نویسی کا اسلوب وضع کرنے کی کوشش کی ہے یہ اسلوب ایسا ہے جو نہ افسانے کا اسلوب ہے اور نہ شاعری کا اور نہ خشک قانونی عبارت ہے اور نہ ہی خشک تحقیقی اسلوب ہے بلکہ بیان میں دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے بات سے بات کو داستان کی طرح بیانیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔'' (29)

ادبی تاریخ کے اسلوب بارے اگرچہ مختلف محققین، مورخین اور ناقدین کی رائے میں اختلاف موجود ہے بعض ناقدین کی رائے ہے کہ ادبی تاریخ کا اسلوب سیاسی تاریخ جیسا ہو مگر کچھ مُحققین و ناقدین کی رائے ہے کہ ادبی تاریخ کا اسلوب سادہ اور واضح ہو، اس میں شگفتگی ہو۔ البتہ الفاظ کی جادو بیانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ مورخ کو ایک ایسا سلوب بیان اختیار کرنا چاہیے جس میں گُنجل نہ ہو۔ ہر بات واضح طور پر دکھائی دے۔ ادبی تاریخ نویسی کے اصول اور ضابطوں کی مباحث کے آخر میں ادبی مورخ کی استعدادِ کار کے بارے میں بات کرنا ضروری ہے۔

تاریخ ادب متحرک اور فعال فن کی داستانِ ارتقاء ہے جس میں مختلف اصناف و افراد اور ادوار کے مابین تاریخی، منطقی، فکری اور سماجی جوڑ ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کو عام اور واضح رشتے میں پرونے ان میں فکری اور تاریخی نظم وضبط پیدا کرنے کا کام ادبی مورخ کا ہے۔ اس عمل کے دوران میں ادبی مورخ کو تحقیق، تجزیہ اور تنقید سے کام لینا پڑتا ہے۔ ادبی مورخ کا کام تخلیق اور اس کے خالق کا مطالعہ کر کے تخلیقات کی معیار بندی کرنا اور ان کی مدد سے ایک خاص اور زیادہ بہتر معیار متعین کرنا ہوتا ہے۔ اس معیار بندی کے لیے وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی

اور روحانی عوامل کا تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے جو کسی عہد کو ایک مخصوص رنگ عنایت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے میں:

> ''کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سماجی، سیاسی اقتصادی عوامل و محرکات کے عمل اور ردعمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تناظر میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی، لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ تاریخ نگاری اور ان ہی کا مطالعہ، تجزیہ و تخیل اور تشریح ادبی مورخ کا فریضہ ہے۔'' (30)

ادبی مورخ کا کام عام مورخ سے قدرِ مختلف ہے۔ عام مورخ بکھرے ہوئے واقعات و حالات کو سمیٹتا ہے اور ان کو ایک بہتر ترتیب دے کر تاریخ کی تشکیل دیتا ہے۔ ماضی کے بظاہر بکھرے ہوئے بے ربط حالات و واقعات کا جائزہ لے کر مورخ ان واقعات کی صحت کا تعین کرتا ہے۔ انہیں ترتین دے کر سنہ وار بیان کرتا ہے۔ اس کے اس ترتیب وار بیان سے واقعات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ایک سلسلہ وار کہانی اپنے اسباب و نتائج کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلہ وار کہانی کو اظہار کرنے کے لیے مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کو صحیح طرح سے بیان کرے، ورنہ یہ کہانی بے معنی اور بے کار ثابت ہوگی۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام تاریخی حقائق اور واقعات کو ان کے سیاق و سباق کے حوالے سے بیان کرے تا کہ واقعات کی اصل صورت سامنے آجائے۔ یہی وہ تاریخی شعور ہے جسے مورخ اپنی تحریر سے قاری میں بیدار کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف جہاں ماضی کے تاریک لمحے روشن ہوتے ہیں تو دوسری طرف نفرت و تعصب اور ذہنی تنگ فکری دور ہوتی ہے۔ اور ذہن کو نئی سوچ اور فکر کی نئی روشنی ملتی ہے۔ ہر تاریخ ایک مورخ کے خاص نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے کس

طرح چیزوں کو دیکھتا اوران سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔اس کے اپنے فکر اور خیالات کس نوعیت کے ہیں۔واقعات اوران کے نتائج کے ردوقبول میں وہ کن باتوں کو اہمیت دیتا ہے۔ان باتوں کو دیکھنا اور سمجھنا بہت ضروری ہے۔کیونکہ مورخ کے نقطہ نظر اس کی پسند اور ناپسند کا اس کی تاریخ نویسی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔مورخ کے انداز فکر سے انسانی عمل اور انسانی معاشرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔کیونکہ وہ ماضی کے ہر وقعے اور تحریک کا گہرائی اور گیرائی سے تجزیہ کرتا ہے اوران کے داخلی پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر اس فکر کو عیاں کرتا ہے۔جوان واقعات کی تہہ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔حالات،واقعات کے اس تجزیہ میں مورخ کی ذاتی رائے،سیاسی،مذہبی نقطہ نظر کی شمولیت تاریخ کو ایک خاص انداز میں ڈال دیتی ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عام مورخ اور ادبی مورخ میں مشابہت کے ساتھ ساتھ اختلافی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔حقائق کا بغوٗر مطالعہ اور سچائی کی تلاش وجستجو اوراس کا بیان ادبی مورخ کا بھی فریضہ اولین ہے۔البتہ ادبی مورخ کی جستجو کا میدان صرف ادب سے متعلق ہوتا ہے۔ادبی مورخ کا کام مجموعی یا کسی خاص دور کی ادبی تخلیقات اوران کے خالقوں کا مطالعہ کر کے ایک خاص معیار متعین کرنا ہوتا ہے۔اس معیار بندی کے لیے وہ عام مورخ کی طرح سیاسی،سماجی،تہذیبی،تمدنی اور روحانی عوامل کا گہرا تجزیاتی مطالعہ کرتا ہے۔جو کسی عہد کو ایک مخصوص رنگ اور کیفیت عطا کرتے ہیں۔ادبی مورخ کسی دور کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے ذہنی رجحانات،تخلیقی میلانات اور فنی روایات کا بھی مطالعہ کرتا ہے جو ایک مشکل کام ہے۔کیوں کہ یہ سب چیزیں ٹھوس وجود نہیں رکھتیں۔شعر و ادب میں یہ چیزیں منتشر اور غیر محسوس انداز میں بکھری ہوئی صورت میں ملتی ہیں۔ادبی مورخ کا کام انھیں تلاش کر کے ایک پیکر تراشنا ہوتا ہے۔اور یہ عمل عام مورخ کے عمل سے قدرِ مشکل ہے۔ادبی مورخ فن پاروں کے حوالے سے مختلف ادوار کی ادبی تحریکات تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ان تحریکات

کے پس پشت جو شخصی اور غیر شخصی افکار و رجحانات کے باہمی امتیازات اور ان کے ماحول کے مطابق ان کی ارتقائی جدوجہد کے حالات و واقعات کی تاویل و تعبیر میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین رابرٹ اسپلر (Robert Spiller) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ادبی مورخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے۔ جو ادبی تنقید سے مختلف ہے۔ وہ ان عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جن کے زیر اثر تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ وہ کوئی نظریہ قائم کر کے اسے جانچتا ہے۔ اور اس عمل میں وہ کسی حد تک نقاد بن جاتا ہے۔'' (31)

ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ تاریخی حقائق کی وجوہ کی اچھی طرح چھان بین کر کے انھیں صحیح طرح بیان کرے۔ اس طرح اس کا کام محقق جیسا ہو جاتا ہے۔ جو واقعات و حالات کی صحیح اور غیر جانبدارانہ تحقیق کرتا ہے۔ ایک کامل محقق کوئی علمی یا ادبی واقعے کی تصدیق کے لیے شہادتیں مہیا کرتا ہے۔ پھر ان شہادتوں کا احتیاط سے تجزیہ کرتے ہوئے درجہ بندی کرتا ہے۔ پھر مضبوط دلائل کو منطقی بنیادوں پر استوار کر کے زیر بحث مسئلے پر ان کا اطلاق کرتے ہوئے متنازعہ مسئلے کا تسلی بخش حل پیش کرتا ہے۔ اور تجزیاتی اندازِ فکر سے اپنے پیش نظر مفروضے کو ایک نظریے کی شکل بنا دیتا ہے۔ اس لیے ادبی مورخ کو اپنے پیش نظر موضوع پر مواد فراہم کرنے کے لیے مآخذ کی جستجو میں بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

ادبی مورخ کو تحقیق کا سہارا لینا بھی پڑتا ہے۔ سچائی کی تلاش میں اسے بے حد محنت و مشقت اور وقت بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ ادبی حقائق کا اپنے عہد کی تاریخ سے ناقابل شکست رشتہ ہوتا ہے اور کسی ادبی تالیف میں پائے جانے والے حقائق کی بازدید اور ترجمانی کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے اس دور کی مستند تواریخ پر عبور اور تہذیبی اقدار کا شعور رکھنا ضروری ہے۔ اس

لحاظ سے مورخ اور محقق تقریباً ایک ہی جیسی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

ادبی مورخ کے لیے چند اوصاف کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

ادبی مورخ ایسا ہو کہ وہ فلسفہ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ دیگر امدادی علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات، نفسیات، سماجیات اور فلسفے کے بارے میں بنیادی معلومات رکھتا ہو۔ تاکہ ایک معیاری ادبی تاریخ لکھنے کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔

مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی تاریخ میں ادب کے ارتقاء کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہو اور تمام پہلوؤں کا مجموعی طور پر احاطہ کر سکے۔

حقائق سندی حوالوں کے ساتھ پیش کیے جائیں ثانوی مآخذات کی بجائے بنیادی مآخذات کو اہمیت دینی چاہیے۔

مآخذات کی تصدیق کے لیے داخلی اور خارجی تنقید کے اصولوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔

مُصنفین، شعراء اور ادیبوں کے کوائف، پیدائش، وفات، تصانیف بارے سنین، ہجری اور عیسوی دونوں درج ہونے چاہئیں۔

ادوار بندی کے سلسلے میں مؤرخ کو اپنی تنقیدی بصیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

ادبی تاریخ کو متوازن انداز میں لکھا جائے۔

مورخ، تعصب اور جانبداری سے ہٹ کر سادہ عام فہم اور شگفتہ اسلوب اختیار کرے۔

معیاری ادبی تاریخ مورخ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ادب کو ایک اِکائی کی صورت میں پیش کرے۔

ادبی مورخ میں مورخانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ناقدانہ اندازِ نظر اور محققانہ اندازِ

فکر کا ہونا بھی بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اصلی حقائق اخذ کرنے کے لیے تنقید و تحقیق پیشہ ورانہ صلاحیت کی بنا پر کی جانے چاہیے۔ اس طرح مورخ کو ماضی کے معمولی واقعات سے کسی بڑی حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے فہم و فراست سے مالا مال ہونا چاہیے۔ نیز ادبی حالات و واقعات کے انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین میں ناقدانہ صلاحیتوں کا استعمال کرسکتا ہے۔ تب ہی وہ ایک مستند اور جامع تاریخ ادب مرتب کرسکتا ہے۔

حوالہ

1. غازی اعظم، شاہ ابوالحسن ادیب، ص:15
2. The New Encyclopaedia Britannia In Vol 30, Page: 64
3. تاریخ کے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی گل، ص:59
4. سرگذشت تاریخ، ڈاکٹر صادق علی گل، ص:33
5. مقدمہ ابن خلدون، مولوی راغب رحمٰنی، ص:167
6. الفاروق، شبلی نعمانی، ص:54
7. برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:29
8. What is History, E.H Carr, P: 15
9. اردو میں تاریخ نویسی، مشمولہ سہ ماہی تاریخ، جنوری 2007
10. www.Britannica.com/art/literature
11. مباحث، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:22
12. قدیم ادبی تنقید، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ص:12
13. علی گڑھ میگزین، نظریاتی نمبر 1958، احتشام حسین ص:33
14. ادب اور زندگی، پروفیسر احمد صدیق مجنون، ص:5
15. ادب اور زندگی، پروفیسر احمد صدیق مجنون، ص:9
16. تاریخ ادب مقاصد و محرکات، مشمولہ اردو کی ادبی تاریخیں، نظری مباحث، ڈاکٹر سلیم اختر، ص:156
17. W.H Hudson An outline history of English literature, P: 2
18. Theory of Literature, Rene Wellek and Austin Warren, P: 252
19. ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ تخلیقی ادب جنوری 2008 تبسم کاشمیری، ص:19
20. تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:362
21. تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:362
22. تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:14
23. اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:19
24. اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:15
25. ادبی تاریخ کے اصول، ظفر احسن لاری، ص:9
26. اردو ادب کی تاریخ، تبسم کاشمیری، ص:10
27. تاریخ اادب اردو کی تدوین، علی جواد زیدی، ص:
28. تاریخ ادب اردو-جلد 2، جمیل جالبی ص:12
29. تاریخ ادب اردو-جلد 2، جمیل جالبی ص:17
30. تاریخ ادب مقصد و محرکات، ڈاکٹر سلیم اختر، ص:15
31. اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:24

اردو زبان میں ادبی تاریخ کے اولین نقوش

''تذکرہ'' اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں شعرا کے حالات اور نمونہ کلام جمع کیے گئے ہوں۔بعض لوگ اسے بیاض کی ترقی یافتہ شکل اور تاریخِ ادب کا ابتدائی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ابتداء میں جب شعروشاعری کا رواج عام تھا،تو ادب سے ذوق وشوق رکھنے والے اپنی پسند کے اشعار اپنے پاس لکھ کر رکھ لیتے تھے۔اس کو بیاض کہا جاتا تھا۔یہ بیاضیں اپنی جگہ پر بہت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی تھیں۔ان میں اشعار کے انتخاب کے ساتھ ساتھ شاعروں کے نام اور تخلص بھی محفوظ کیے جاتے تھے۔یہ انتخابات کسی خاص انداز میں ترتیب دیے جانے لگے نیز ان شعراء کے مختصر حالات وخصوصیات کلام کے اضافے ہوتے گئے اور تذکروں کا روپ دھار تے گئے۔بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''بیاض کی ترقی یافتہ صورت کا نام تذکرہ ہے۔بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا تھا جب اس میں انتخاب اشعار کے ساتھ صاحبانِ اشعار کے نام اور تخلص کا اضافہ کر دیا گیا تو اس کا نام تذکرہ ہو گیا۔'' (1)

ڈاکٹر نیاز سلطان پوری بھی فرمان فتح پوری سے متفق نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تذکرہ کی یوں تعریف کی ہے:

''تذکرہ ایک مرکب صنف ادب ہے۔اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعراء کے مختصر احوال اور منتخب کلام درج کیا گیا ہو علاوہ ازیں شعرا کے کلام پر مختصر الفاظ میں تنقیدی رائے بھی دی گئی ہو۔(2)

تذکروں میں شاعر کے نام کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے اور کہیں کہیں اس پر تنقیدی تبصرے بھی پائے جاتے ہیں۔کلیم الدین احمد نے تذکرہ نگاری پر یوں رقم طراز ہیں:

''تذکروں میں جو مختصر بیان ہوتا ہے۔اس میں تین اجزا ہوتے ہیں 1) شاعر کی زندگی 2) شاعر کی شخصیت 3) شاعر کے کلام پر تنقید۔'' (3)

تذکرہ تاریخ سے جاملتا ہے۔تذکروں میں ہمیں تاریخ کے پہلو اکثر نظر آتے ہیں۔ تنویر احمد علوی نے اس پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''تذکرہ کا تاریخ سے گہرا رشتہ ہے۔اس لیے اس کے ذریعے افراد کی بھی تاریخ مرتب ہوتی ہے ادوار کی بھی تحریکات کی بھی۔کہیں کوئی گوشہ سامنے آتا ہے کہیں کوئی دوسری حقیقت پیش نظر رہتی ہے اور جب اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو تاریخ وتہذیب سے متعلق نئی سچائیوں پر نظر جاتا ہے۔(4)

اردو ادب کی تاریخ میں تذکرہ نگاری ایک اہم مقام رکھتا ہے۔اردو کے اولین دور کے شعرا کے بارے میں جو کچھ مواد ہمیں حاصل ہوئی ہیں، اس میں تذکروں کا بہت ہی اہم رول رہاہے۔ڈاکٹر رئیس احمد کا کہنا ہے:

''شعرائے اردو کے تذکرے تاریخ ادب کا ایک جزو بھی ہیں اوراس کی بنیاد بھی۔تذکروں نے بلا استثنا جملہ ادبی مورخین کے لیے بطور خاص ادبی تاریخ وتحقیق اور تلاش وجستجو کی ظلمتوں میں قندیل راہ کا کام کیا ہے۔'' (5)

تذکروں میں سوانحی حالات کی جھلکیوں، تاریخی پرچھائیوں اور تنقیدی تبصروں کا رنگ جھلکتا ہے۔اور انھیں عوامل کا بہترین امتزاج تذکرہ نگاری کا فن قرار پاتا ہے۔اردو میں تذکرہ نگاری کا فن فارسی کی دین ہے۔اور اردو شعراء کے ابتدائی تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔میر کا نکات الشعرا، قائم چاند پوری کا تذکرہ مخزن نکات اور فتح علی گردیزی کا تذکرہ ریختہ گویاں اولین دور کے تذکرے ہیں۔تذکرہ نگاری کی اس روایت میں جو تذکرے ملتے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں شعراء کے حالات زندگی بہت مختصر ہیں۔البتہ انتخاب کلام

بہت طویل ہے۔ بعض تذکروں میں ایسے اشعار یا جملے بھی مل جاتے ہیں جن سے شعراء کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کی دھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے۔ بعض تذکروں کے مرتبین نے کلام کے تنقیدی تبصرے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بالعموم ان کا انداز یکسانیت کا شکار رہتا ہے۔ یعنی ان میں تاثراتی تنقید یا لفظی تنقید غالب رہتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو تذکرہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو تذکرہ نویسی اپنے ارتقائی سفر میں تین اہم مراحل میں سے گزرتی ہے۔ میرؔ کی نکات الشعرا پہلا بڑا سنگِ میل ہے۔ دوسرا دور گلزارِ ابراہیم سے شروع ہوتا ہے جس میں تذکرہ نویسی پر جدید اثرات کا پرتو پڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب کسی حد تک جدید ماحول میں لکھی جاتی ہے اور اس میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو سابقہ تذکروں میں مفقود تھیں۔ کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعراء کی اشاعت سے تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔(6)

اردو تذکرہ نویسی کا پہلا دور میرؔ سے لے کر مردان علی خان کے تذکرہ ''گلشن سخن'' تک کا زمانہ نظر آتا ہے۔ اس دور میں میرؔ، حمید اورنگ آبادی، قائم چاندپوری وغیرہ تذکرہ نگار کی حیثیت سے مشہور رہیں۔ ''نکات الشعرا''، گلشن گفتار اور مخزنِ نکات اردو شعرا کے اولین تذکرے مانے جاتے ہیں۔ یہ تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے لیکن انتخاب کلام اردو زبان ہی میں دیا گیا ہے۔ اس دور کی واضح خصوصیت میں ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ سب تذکرے مختصر ہیں۔ کیونکہ اس دور میں انتخاب کلام کا رجحان تھا۔ اس دور کے تذکروں میں پانچ تذکرے ایسے ہیں جن میں ایک سو شعرا کا انتخاب بھی شامل نہیں ہے۔ کچھ تذکروں میں یہ تعداد تین سو کے قریب ہیں۔ اس دور کے تمام تذکروں میں میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کلام پر تبصروں اور آرا کے اعتبار سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد تذکرہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جسے جامعیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور علی ابراہیم خلیل کے تذکرے ''گلزار ابراہیم'' سے شروع ہو کر قطب الدین باطن کے تذکرے ''گلستان بے خزاں'' تک پھیلا نظر آتا ہے۔اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں کی ضخامت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ان تذکروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر تذکرہ نگار اپنے تذکرے میں ہر اس شخص کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے جو شعر کہہ سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تذکرہ نگار ہر کس و ناکس کا ذکر کر کے اپنے تذکرے کو ضخیم سے ضخیم تر بنانے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان تذکروں میں چھ سات سو شعراء سے لے کر پندرہ سو شعراء تک کا ذکر ملتا ہے۔اس ضخامت کی بناء پر ان تذکروں میں بہت سی خرابیاں در آئی ہیں ۔مثلاً بہت سے تذکروں میں تکرار کی کیفیت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے تذکرے ناقص معلومات پر مبنی ہیں۔اس دور کے اہم تذکرے ''عیار الشعراء'' اور اعظم الدولہ سرور کا لکھا ہوا تذکرہ ''عمدۃ المنتخبہ'' ہیں۔''عیار الشعرا'' کو اس دور کا ضخیم تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں پندرہ سو شعرا کا ذکر ملتا ہے۔معلومات کے اعتبار سے ''مجموعہ نغز'' کو ایک بہتر کوشش کہا جا سکتا ہے جبکہ ''گلزار ابراہیم'' میں شعرا کے حالات زیادہ واضح اور معتبر ہیں۔

جامعیت کے اس رجحان کے بعد ایک بار پھر انتخاب کا رجحان پیدا ہوا۔ اس دور میں صرف انہی شعرا کے حالات و واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ جو اہم سمجھے جاتے ہیں۔ نیز حالات و واقعات کے ضمن میں صحت و سند کا بھی خیال رکھا جانے لگا۔ یہ دور کریم الدین کے تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' لے کر مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' تک پھیلا ہوا ہے۔آب حیات کے بعد بھی کچھ تذکرے لکھے گئے مگر ان کا انداز وہی قدیم تذکروں والا ہے۔ اس دور میں لکھے گئے بہت سے تذکروں کو اپنے عہد کی اچھی اور یادگار کوشش قرار دیا جا سکتا

ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ تذکرہ نگار کم از کم اپنے دور کی شاعرانہ فضا اور ادبی ذوق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ان تذکروں سے بہت سی تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔قدیم وجدید ادوار کا فرق اور اسلوب شعر و ادب کی تبدیلیوں کا شعور بھی ان تذکروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اہم چیز یہ ہے کہ ان شعرا کے مراتب بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔قدیم شعرا کے حالات وواقعات بیان کرنے کے لیے بعد میں ادبی مورخین نے زیادہ تر انہی تذکروں پر انحصار کیا ہے۔ ان تذکروں میں تنقیدی اشارے بھی ملتے ہیں جو تذکرہ نگاروں کے تنقیدی شعور کا احساس دلاتے ہیں۔

تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کا پیش قیمت سرمایہ ہیں۔ انہیں تاریخ نگاری میں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری تذکروں کو دو ادوار میں منقسم کی ہے۔1-اٹھارہویں صدی کے تذکرے 2-انّیسویں صدی کے تذکرے۔ ان کے مطابق اٹھارہویں صدی کے تذکرے سولہ سے زیادہ دستیاب نہیں۔ان میں سے کچھ تذکرے شمالی ہند میں اور کچھ دکن میں لکھے گئے اور یہ سب تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔ ان کی خصوصیت ان کا اختصار ہے۔ان میں تراجم کی نوعیت ایک سی ہے۔یعنی بہ لحاظ حروف تہجی شاعروں کے تخلص مرتب کئے گئے ہیں۔ جبکہ اہم واقعات کے سنین بھی نہیں دئے گئے اور نہ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔کلام پر ذاتی رائیں یا تبصرے بھی نہیں ہیں۔عموماً ایک ہی قسم کی تعریف سب کے لئے کی گئی ہے۔

''مخزن نکات'' اور تذکرہ میر حسن میں اردو شعرا کو ادوار میں تقسیم کر کے عہد بہ عہد رنگ شاعری دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔عمومی طور پر موضوع و مواد اور تفصیل وتوضیح کے حوالے سے ان میں کسی قسم کا تنوع نہیں ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے تذکروں کو طرز جدید کے تذکرے کہتے ہیں۔اس دور میں فارسی

کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی تذکرے سامنے آئے نیز انگریزی اور فرانسیسی میں بھی تذکرے لکھے گئے تذکرہ نگاری کی قدیم طرز میں تبدیلی آئی اور دستاویزی شہادتوں کی بدولت مستند مواد پیش کیا جانے لگا۔علاوہ ازیں اس دور میں ان تذکروں میں ادبی تاریخ اوراسالیب کی ارتقائی کڑیاں ملانے کی شعوری کوشش کی گئی۔شعروادب کے مروجہ موضوعات ومسائل پر بھی بحثیں چھیڑی گئیں۔اشاعت اور مواد کی فراہمی کی آسانیوں کے باعث تذکرہ نگاری کی روایت تیز رفتار ہوگئی اور دو درجن سے زائد تذکرے معرض وجود میں آئے۔

یہاں چند ایسے تذکروں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جو تذکرہ نویسی کی عام روایت سے قدرے مختلف ہیں اوران میں تاریخ نگاری کا ابتدائی شعور نظر آتا ہے۔

نکات الشعراء

میر تقی میرؔ کا یہ تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کا بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔اس کا سال تکمیل 1752ء ہے۔اسی دور میں چند اور تذکرے بھی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ان میں ''گلشن گفتار'' مؤلفہ حمید اورنگ آبادی اور''تحفۃ الشعرا''از افضل بیگ اسی سال منظر عام پر آئے۔ان تینوں تذکرے دیگر تذکروں کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں نکات الشعراء سب سے اوّل پر ہے۔کیونکہ یہ نہ صرف اپنے معاصر تذکرہ نگاروں بلکہ بعد میں لکھے گئے تذکروں کو بھی بہت حد تک متاثر کیا۔

نکات الشعراء فارسی تذکرہ نویسی کی روایت سے متاثر ہے۔اس میں شعراء کے حالات اورکلام پر رائے فارسی زبان میں ہے۔اس تذکرہ میں کم وبیش ایک سوتین شعراء کے حالات زندگی اوران کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''فنِ تذکرہ نویسی کے لحاظ سے نکات الشعراء معیاری فارسی تذکروں کے پائے کا

نہیں ہے۔ اس تذکرے میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اسے نہ تو حروف تہجی کے
اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ نہ موضوع یا زمانے کے اعتبار سے۔'' (7)

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود الٰہی کا کہنا بھی درست معلوم ہوتا ہے:

''میرؔ نے یہ تذکرہ بڑی روا روی میں لکھا۔ ان کے سامنے شعرا کی ترتیب کا کوئی اصول نہیں تھا۔ انھوں نے نہ تو شعرا کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے کی اور نہ ان کا ذکر حروف تہجی یا حروف ابجد کی ترتیب سے کیا۔ شعرائے دکن کا ذکر یکا یک ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ وسط کتاب میں آجاتا ہے اور پھر اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر شمالی ہند کے شعرا جگہ پاتے ہیں۔'' (8)

اس میں صرف ایک نیم تاریخی سی ترتیب ہے اور سب سے پہلے امیر خسرو کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین خان آرزو، مرزا فطرت موسوی، مرزا جانِ جاناں مظہر، شاہ ولی اللہ اشتیاق وغیرہ کا ذکر ہے۔ سب سے آخر میں میر نے اپنا ذکر کیا ہے اور خاتمے پر ڈیڑھ صفحے میں ریختہ کی تعریف بیان کی ہے۔ ''نکات الشعراء'' میں میرؔ نے شعراء کے حالات اور ان کی زندگی کے واقعات کا بیان مختصر انداز میں کیا ہے۔ نیز وہ ولادت، وفات یا اہم واقعات زندگی کے سنین بھی نہیں دیتے جس کی وجہ سے ''نکات الشعراء'' کا تاریخی پہلو خاصا کمزور رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت سی دیگر خوبیاں اور حاصل شدہ معلومات کی بدولت اس کی اہمیت مسلم ہے۔ میرؔ نے اپنے تذکرے میں اردو زبان اور شاعری کی ابتدائی نشوونما کے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ جو اردو زبان و ادب کے شائقین اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بیش بہا خزانہ ہیں۔ کیونکہ ان معلومات کا کسی اور ذریعے سے حاصل ہونا ممکن نہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''میرؔ نے اپنے تذکرے میں اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ کہ ریختہ یعنی اردو

کا آغاز دکن میں ہوا اور وہاں دکنی اردو کے شاعر پیدا ہوئے۔۔دکنی اردو شعرا میں
سے سعدی دکنی، غواصی، ولی، سراج وغیرہ کا ذکر اختصار کے ساتھ میر نے اپنے
تذکرے میں کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اردو زبان کے ہر پہلو سے
گہری دلچسپی ہے'' (9)

نکات الشعراء کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی ادبی گروہ بندیاں موجود تھیں اور ان سے تعلق رکھنے والے شعرا کس قدر متعصب تھے۔ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

''اس تذکرے سے اس دور کی ادبی گروہ بندی کا بھی سراغ ملتا ہے۔میرؔ نے ان
شعراء کے ذکر میں جانبداری برتی ہے، جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اس
میں وہ شعراء شامل ہیں جو آرزو سے وابستہ ہیں یا میر سے جن کے ذاتی تعلقات اچھے
ہیں یا جو میرؔ کے محسن اور رشتہ دار ہیں اور ان شاعروں کو گرایا ہے جو مرزا مظہرؔ سے
تعلق رکھتے ہیں۔'' (10)

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے جواب میں ایسے تذکرے لکھے گئے جن میں میرؔ اور ان سے متاثر شعراء کو ہدفِ تنقید بنایا گیا اور یوں جوابی تذکرے لکھنے کی بنیاد پڑی۔مولوی عبدالحق اس تذکرے کے متعلق کہتے ہیں۔

''میر صاحب تنقید میں مطلق رورعایت نہیں کرتے اور بڑی بے باکی اور آزادی کے
ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔کہیں کہیں اصلاح بھی کر دیتے ہیں۔'' (11)

اسی طرح اور بھی کئی شعراء کے کلام پر میر نے اصلاح دی ہے جو اکثر اوقات بے جا نہیں لگتی بلکہ اس سے میر کے اعلیٰ ذوق اور سخن فہمی کا پتہ چلتا ہے۔

میر تقی میر کو لفظوں سے جیتی جاگتی تصویریں بنانے کا ہنر آتا ہے۔اس حقیقت کا

احساس مختلف شعراء کے متعلق ان کا دیا ہوا تعارف پڑھ کر ہوتا ہے۔ان شعراء کے تعارف میں تاثراتی نقوش گہرے اور دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ وہ مختصر الفاظمیں شاعر کی بھرپور تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ساتھ ''نکات الشعراء'' کے ذریعے میر کے معاصرین اوران کے سماجی ماحول کے متعلق ایسی بہت سی معلومات ملتی ہیں جو کسی اور ذریعے سےنہیں مل سکتی تھیں ۔ اس تذکرے میں اس دور کی تہذیبی ، معاشرتی زندگی، تخلیقی رجحانات اور لسانی معاملات وغیرہ واضح طور پر ملتے ہیں۔

میرؔ کا طرز نگارش بھی بہت ہی خوش آہنگ اور با محاورہ ہے۔اسلوب سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں ماہر تھے۔مثال کے طور پر خان آرزو کی تعریف میں لکھتے ہیں ''چراغ دود مانِ صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خان آرزو۔''اس طرح کی بے شمار مثالیں ہمیں نکات الشعرا میں جگہ جگہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اگر چہ یہ تذکرہ فارسی کے معیاری تذکروں کے معیار کا نہیں ہے۔تاہم پھر بھی اردو تذکرہ نویسی کی روایت میں اس کی بہت اہمیت ہے۔کیونکہ اس تذکرے نے کئی لحاظ سے اپنے بعد کے تذکروں کو متاثر کیا۔اس میں موجود معلومات اور شعراء کے متعلق میرؔ کی آراء، بعد میں آنے والوں نے مستعار لیں۔اور انھیں نقل کیا ہے۔اس کے علاوہ تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان معلومات کا کوئی اور ذریعہ حصول نہیں ہے۔انہی خوبیوں کی اہمیت کی وجہ سے ادبی تاریخ نگاری کی پس منظری تاریخ میں نکات الشعراء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مخزن نکات   قیاالدین قائم چاندپوری

قائم چاندپوری کا یہ تذکرہ 1754ء میں مکمل ہوا۔یہ تذکرہ میر کے تذکرے سے متاثر

ہے۔ یہ بھی روایت کے مطابق فارسی میں لکھا گیا ہے۔اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار شعراء کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں متقدمین شعراء کا ذکر ہے۔ اس میں امیر خسرو سے لے کر جعفر زٹلی تک کا بیان ملتا ہے۔اس میں انھوں نے سعدی شیرازی کو بھی ریختہ گو شعراء میں شامل کیا گیا ہے۔ دور دوم میں آبرو سے لے کر کمترینؔ پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ تیسرے دور میں فقیر سے لے کر خود اپنے بارے میں ذکر کر کے ختم کیا ہے۔اس میں کل ملا کر 128 شعراء کا ذکر کیا ہے۔اس تذکرے پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال بالکل بجا ہے۔

> ''ادبی تاریخ نویسی کا احساس سب سے پہلے مخزن نکات نے پیدا کیا۔مخزن نکات میں مختلف طبقات کے شعراء کی خصوصیات کے مطالعے سے ہر دور کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔مثلاً پہلے طبقے کے شعراء غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن یہ وہ الفاظ ہیں جو اس زمانے میں رائج اور مستند تھے/ ان کا کلام شاعرانہ حیثیت سے غیر مانوس الفاظ کے باوجود مربوط ہے۔ دوسرے طبقے کے شعراء الفاظ تازہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ان پر ایہام گوئی کا اتنا گہرا اثر ہے کہ شاعری بلاغت کے مرتبے سے گر گئی ہے۔ تیسرے طبقے کے شعراء کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا طرز کلام فارسی شاعری کی طرح ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں سارے شعری صنائع بدائع استعمال میں آتے ہیں۔ یہ شعراء فارسی ترکیبات کو اردو کے معنی کے محاورے کے موافق، جن سے کان مانوس ہیں استعمال کرتے ہیں۔ یہی وہ رجحان ہے جس کی پیروی خود قیمؔ اور ان کے معاصرین کر رہے ہیں۔'' (12)

شعراء اور ان کے کلام کے متعلق قائم نے جو تبصرے کیے ہیں، وہ بہت ہی مختصر ہیں۔ پھر بھی ان میں اعلیٰ قسم کے تنقیدی شعور پائے جاتے ہیں۔اور شعراء کو ادوار میں تقسیم کر کے

ان کے کلام کو پرکھنے کا یہ عمل بعد میں ادبی تاریخ نگاری کا ایک اصول بن گیا۔ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

''تذکرہ نویسی میں یہ تاریخی احساس لٹریری ہسٹری کی طرف رجحان کا پہلا قدم ہے۔جو آگے چل کر''آب حیات'' کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔''(13)

طبقات الشعراء-قدرت اللہ شوق

یہ تذکرہ چار حصّوں میں منقسم ہے۔حصّہ اوّل میں شعرائے دکن اور ان کے بعض معاصرین کا ذکر ملتا ہے۔دوسرے حصے میں ایہام گوشعراء کا ذکر ہے۔تیسرے حصے میں اپنے دور کے مشہور شعراء کا ذکر کیا ہے۔اور چوتھے حصے میں تازہ گوشاعروں کا تعارف ہے۔شوق کا یہ تذکرہ روایتی انداز میں لکھا گیا ہے۔اس میں تنقیدی عنصر بہت کم ہیں۔زیادہ تر شعراء کے کلام کی تعریف ملتی ہے۔بہت کم ایسے تبصرے ملتے ہیں جہاں شعراء کے کلام کی خامیوں پر بحث کی گئی ہو۔اس تذکرے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے نمونے کے طور پر غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کا بھی سہارا لیا ہے۔جبکہ اس دور کے عام تذکروں میں صرف غزل کے اشعار کے ہی نمونے ملتے ہیں۔

تذکرۃ الشعراء(تذکرہ شعرائے اردو)-میر حسن دہلوی

یہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔اس میں تقریباً تین سو سے زیادہ شعراء کا ذکر ملتا ہے۔اوراس میں انھوں نے تین ادوار قائم کیے ہیں۔اور ہر دور کے شعراء کو حروف تہجی کے لحاظ سے پیش کیا ہے۔میر حسن نے قائم کے تذکرے کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔انھوں نے اس میں اپنے معاصرین کے متعلق درست معلومات فراہم کی ہیں۔اس تذکرے میں غیر جانب داری

کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔اس لیے ان کے تبصرے میں سنجیدگی اور توازن کا احساس ہوتا ہے۔اور ان کی زبان صاف اور شگفتہ ہے۔جو اس تذکرے کو مزید خوبصورت بنا دیتی ہے۔ان کے انتخاب کلام سے ان کے سنجیدہ ادبی ذوق اور عمدہ تنقیدی نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس تذکرے کی ایک خامی یہ ہے کہ حالات و واقعات کے سنین ہر جگہ درج نہیں کی ہیں۔

گلشن ہند-مرزا علی لطف خان

گلشن ہند کی خاصیت یہ ہے کہ اردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے۔اس سے پہلے اردو شعراء کے تذکرے فارسی میں لکھتے تھے اور کلام کے نمونے اردو میں دیتے تھے۔یہ مرزا علی لطف خان کا طبع زاد نہیں بلکہ علی ابراہیم خلیل کے فارسی تذکرے ''گلزار ابراہیم'' کا اردو ترجمہ ہے۔لیکن لطف نے اس کا صرف لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس میں بعض جگہوں پر معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

''یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جبکہ ادب سے متعلق اردو نثر کا کوئی نمونہ یا معیار موجود نہ تھا۔اس لحاظ سے یہ تذکرہ قدیم نثر اردو کا ایک قیمت سرمایہ ہے۔''(14)

مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسمؔ

یہ فارسی زبان میں لکھا ہے۔اس میں 600 سے زیادہ شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ان میں دورِ قدیم کے شعراء سے لے کر قاسمؔ کے معاصرین تک کا ذکر ملتا ہے۔اس تذکرے میں شاعروں کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اور شعراء کے کلام کے نمونے بھی تفصیل سے پیش کئے ہیں۔اس میں شعراء کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔اس میں اس دور کے ادبی و سماجی حالات کا بھی بیان ملتا ہے۔اس کی ایک اہمیت یہ ہے کہ یہ آب حیات کا ماخذ

ہے۔اس میں بیان کردہ بہت سارے واقعات کو آزاد نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں بیان کردہ واقعات مستند ہیں۔

ہندوستانی ادب کی تاریخ-گارسین دتاسی

یہ مشہور فرانسیسی گارسین دتاسی کا تذکرہ ہے۔یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کے دوایڈیشن دتاسی کے دورحیات ہی میں شائع ہوئے۔اس میں تین ہزار شعراء کا ذکر ملتا ہے۔اس میں شعراء کی ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق کی ہے۔اس تذکرے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے شاعر کو جگہ دی گئی ہے۔اور ہر عہد کے شعراء کی اہمیت پر اپنی رائے پیش کیا ہے۔یہ تذکرہ فرانسیسی زبان میں لکھا ہے۔اور اس کی تحریر کے لیے وہ کبھی ہندوستان کا سفر نہیں کیا۔اور اس تذکرے میں انھوں نے روایتی انداز کو بھی بدل ڈالا۔یعنی شعراء کے علاوہ نثر نگاروں کو بھی انھوں نے اس تذکرے میں شامل کیا ہے۔اور کلام کے نمونے انھوں نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے دیے ہیں۔اور اردو ادیبوں کے ساتھ ساتھ ہندی کے لکھنے والوں کا بھی ذکر اس میں ملتا ہے۔بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''اگر یہ تذکرہ موجود نہ ہوتا تو اردو زبان و ادب کی تاریخ کا بہت سا قیمتی مواد اور بہت سے اہم ماخذ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے۔حق بات یہ ہے کہ اس تذکرے نے ادبی تاریخ و تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے اور پاک و ہند سے باہر اردو کو روشناس کرانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔'' (15)

انتخاب دواوین مولوی امام بخش صہبائی

یہ تذکرہ اردو زبان میں لکھا ہے۔اور اس میں صرف بارہ منتخب شعراء کے حالات اور انتخاب کلام پر مبنی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

''اس کتاب کا جو حصہ نہایت پیش قیمت ہے وہ اس کا دیباچہ ہے۔ اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف، تاریخ، وزن، قافیہ، ردیف، عروض اور اصنافِ سخن پر اجمالاً لیکن عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ اصناف شعر پر خصوصیت سے بحث کی گئی ہے۔ ہر صنف کے مخصوص و مفید اوزان کی نشاندہی کی گئی ہے اور مشہور شعراء کے کلام سے نمونے دیے گئے ہیں۔ ان امور پر اس سے پہلے گارسن دتاسی کے سوا کسی اور تذکرہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی۔'' (16)

اس کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں مرزا غالب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور زیادہ تر بیانات اس سے قبل لکھے گئے تذکروں سے ہٹ کر نہیں ملتے۔ اس لیے یہ تذکرہ معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا ہے۔

طبقات الشعراء کریم الدین

یہ تذکرہ 1846ء میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ تذکرہ بڑی حد تک گارسین دتاسی کے تذکرے سے متاثر ہے۔ اس میں شعراء کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ اس سے اردو شاعری کی عہد بہ عہد ترقی کا پتہ ہم آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ طبقات الشعراء میں کہیں کہیں گارسین دتاسی کے تذکرے کا ترجمہ بھی نظر آتے ہیں۔ کریم الدین نے تذکرے کی ترتیب ادوار میں کیا ہے۔ اور اکثر جگھوں پر تاریخ کا التزام بھی کیا ہے۔ اس تذکرے کی ایک اہم جز و اس کا مقدمہ ہے۔ جس میں انھوں نے تذکرے اور تاریخ کی تفریق پر روشنی ڈالی ہے۔ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں شعراء کے علاوہ نثر نگاروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اور فارسی شعراء کا بھی ذکر اس میں انھوں نے کیا ہے۔ طبقات الشعراء کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری یوں لکھتے ہیں:

''اس میں مبالغہ و تصنع یا پاس داری کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو قدیم تذکرہ نگاروں کی خصوصیت ہے۔'' (17)

الغرض یہ تذکرہ اردو تذکرہ نگاری میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اور ادبی تاریخ کے اہم ماخذ میں اس کا شمار ہے۔

آب حیات مولانا محمد حسین آزاد

یہ تذکرے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس میں آزاد نے اردو زبان کی تاریخ بیان کی ہے۔ آب حیات میں انھوں نے پانچ ادوار قائم کی ہے۔ اور ہر دور کے مشہور شعراء کے مختصر سوانح، شاعری کی خصوصیات اور انتخات کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ آزاد کا طرز بیان دیگر تذکروں سے بے حد مختلف ہے۔ انھوں نے شعراء کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کی تکمیل میں انھوں نے قدیم تذکروں کا استفادہ کیا ہے۔ اور اپنے زمانے کے عالموں سے بھی مشورہ لیا ہے۔ آب حیات کے ذریعے محمد حسین آزاد نے تذکرہ نگاری کے لئے ایک نیا طرز پیدا کیا، جو ادبی تاریخ نگاری کے قریب ہے۔ کیونکہ اس میں شعراء کا تذکرہ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے ہے۔ اس کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ اکثر واقعات سچائی سے دور ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''آزاد کو تحقیق کے جو مواقع میسر تھے، انھوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تلاش و تحقیق نہ کی۔ جو کچھ مواد ملا اسے چھان پھٹک کے بغیر استعمال کر لیا۔ بار ہا سنہ اور تاریخ لکھنے میں سہو کیا۔ اشعار کا غلط انتساب کیا۔ دوسرے تذکروں سے جو کچھ لیا اس کا حوالہ نہ دیا۔'' (18)

ان خامیوں کے باوجود بھی آب حیات اردو کی ادبی تاریخ نگاری میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی ہمہ گیری ادبی دنیا میں مسلّم ہے۔ کیونکہ اس میں تاریخ اور تنقید کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

آب حیات ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد لکھے گئے تمام تذکروں میں آب حیات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان، پیش کش اور ترتیب بعد کے تذکرہ نگاروں پر بے حد اثر کیا۔ اس عہد میں لکھے گئے مشہور تذکروں میں گلِ رعنا، شعرالہند اور خمخانہ جاوید قابل ذکر ہے۔ جن میں تذکرہ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ نگاری کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اور یہ تمام تذکرے اردو کی ادبی تاریخ کے لیے بہت سارے مواد فراہم کی ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی ادبی تاریخ کے اوّلین نقوش تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔

تذکروں کی خصوصیات اوران کا طریقِ کار

تذکرہ ہماری قدیم ادبی صنف ہے۔ گواب تذکرے کی روایت نہیں ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں لکھے گئے تذکرے ادبی مورخ کے لیے آج بھی اہمیت کے حامل ہے۔ اردو شعراء کے تذکرے پہلے فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ بعد میں یہ اردو میں ہی لکھنا شروع ہوا۔ میرؔ کی نکات الشعراء سے لے کر محمد حسین آزاد تک اردو شعراء کے تذکروں کی ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔

تذکرہ نگاری ادبی تاریخ نگاری کے اولین نقوش ہے۔ جس میں شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ضروری معلومات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس لیے تذکرہ ادبی تاریخ نویسیوں کے لیے بہت ہی اہم ماخذ ہے۔ اردو شعراء کی تذکرہ نگاری کی روایت اٹھارہویں صدی کے وسط میں میر تقی میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے ہوا اور بیسویں صدی کے اوائل تک یہ رجحان قائم رہا۔ ''نکات اشعراء'' اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود اولین تذکرہ سمجھا جاتا ہے، جو بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے باعث جوابی تذکرے لکھنے کا رجحان شروع ہوا اور چند ہی عرصے میں بہت سے تذکرے سامنے آئے۔ ان تذکروں کا مجموعی مطالعہ کیا جائے تو ایسی بہت سی خصوصیات نظر آئیں گی جو سبھی تذکروں میں مشترک ہیں۔

البتہ کہیں کہیں کوئی تذکرہ اپنی الگ پہچان قائم کرتا نظر آتا ہے۔ ان تذکروں کی سب سے بڑی خصوصیت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق رنگارنگی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> ''فارسی تذکروں کی طرح اردو تذکروں میں بھی بڑی رنگارنگی ہے۔ بظاہر وہ ایک ہی غرض سے لکھے گئے۔ بحیثیت مجموعی ان کا تنقیدی اسلوب اور تحسینی لب ولہجا ایک سا ہے۔ اس کے باوجود ان تذکروں میں اکتا دینے والی یکسانگی اور یک رنگی نہیں ہے۔ مؤلف کے مزاج، تجرِ علمی، اندازِ تحریر، علاقہ ماحول، عہد اور مقامیت کا انفرادی رنگ ان تذکروں میں کم وبیش نظر آتا ہے۔ اس لیے ان تذکروں میں یکسانگی کے باوجود حد فاصل قائم رکھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔'' (19)

اٹھارہویں صدی کے تذکروں کی ایک واضح خصوصیت ان کا اختصار ہے۔ یعنی ان میں منتخب اور کم شعراء کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھے ہوئے تذکروں میں کم از کم پانچ تذکرے ایسے ہیں جن میں صرف ایک سو شاعروں کا ذکر ہے جبکہ بقیہ تذکروں میں شاعروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تین سو، سوا تین سو تک پہنچتی ہے۔ ان تذکروں پر ابتدائی تذکرے ہونے کے باعث فارسی تذکروں کی چھاپ بہت زیادہ ہے۔ یہ فارسی زبان ہی میں لکھے گئے ہیں۔ البتہ نمونہ کلام اردو زبان میں دیے گئے ہیں۔ ان کے بعد انیسویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں کا رنگ تھوڑا سا مختلف نظر آتا ہے۔ گوکہ یہ بھی فارسی زبان ہی میں لکھے گئے ہیں۔ مگر ان میں شعراء کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے اور کہیں کہیں یہ تعداد ہزاروں میں پہنچ جاتی ہے۔ اس دور کے تذکروں کی خاصیت تفصیل اور ضخامت ہے۔ شہادتوں اور کارآمد حوالوں کی بدولت تذکرہ نگاری ادبی تنقید اور تاریخ کی حدود میں آ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے مروجہ موضوعات و مسائل کی بحثیں اور زبان کے آغاز و ارتقاء کے متعلق بیانات بھی ہمیں ان تذکروں میں نہیں ملتے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مجموعی خصائص کے حوالے سے ان تذکروں کو دو بڑے طبقات میں تقسیم کیا ہے۔جن میں طبقہ اول میں قدیم طرز کے تذکرے ہیں اور یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ایک دبستان میرؔ جن میں میر تقی میر کے رنگ کے لکھے ہوئے تذکرے ہیں۔واقعات میں اختصار اور اصلاح سخن، ان تذکروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ان میں تذکرہ ریختہ گویاں مؤلف فتح علی حسینی، مخزن نکات، مؤلف قائم چاندپوری، تذکرہ شعرائے اردو مؤلف میر حسن دہلوی اور مصحفی کے تذکرے شامل ہیں۔طبقہ اول کی دوسری قسم کے تذکرے وہ ہیں جو دبستان میرؔ کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ان تذکروں میں اختصار پسندی کے برخلاف جامعیت بہ لحاظ اسماء و افراد کی طرف توجہ دی گئی ہے۔تذکرہ ''عیارالشعراء'' مؤلف خوب چند ذکا، اس جامعیت کا بڑا نمائندہ تذکرہ ہے۔مجموعہ ''نغز'' مؤلف حکیم قدرت اللہ قاسم، گلشن بے خار مؤلف مصطفیٰ خان شیفتہ اور ''گلستان بے خزاں'' مؤلف باطنؔ ایسے تذکرے ہیں جن میں جامعیت خصوصیت موجود ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر عبداللہ کے نزدیک طبقہ ثانی میں وہ تذکرے ہیں جو جدید اثرات کے حامل ہیں۔اس طبقہ میں بھی تین اقسام ہیں۔پہلی قسم کے تذکروں میں سوانحیت کا اثر غالب ہے۔ان میں منتخب شعراء کے مفصل حالاتِ زندگی ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی معین کی گئی ہیں۔ان تذکروں میں ''گلزار ابراہیم'' مؤلف علی ابراہیم خلیل اور ''گلشنِ ہند'' مؤلف علی لطف کے نام ہیں۔

دوسری قسم کے تذکروں میں گارسین دتاسی، مولوی کریم الدین اور مولوی اما بخش صہبائی کے تذکرے بالخصوص آتے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقاء کے مطالعے کی طرف بھی توجہ دیا گیا ہے۔اور تیسری قسم میں

مولانا آزاد کا تذکرہ ''آب حیات'' کا نام آتا ہے۔جس میں تذکرہ نویسی کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ کا رنگ ملتا ہے اور بعد کے کئی تذکرہ نویسوں کے ہاں آزاد کا ہی پرتو نظر آتا ہے۔اس دور کے تذکروں میں شعراء کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔یعنی ان شعراء کا ذکر ان کے تخلص کے ابتدائی حروف کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔کچھ تذکروں میں حروف ابجد کی ترتیب ہے جبکہ کچھ تذکروں میں طبقات کے اعتبار سے شعراء کو تقسیم کیا گیا ہے۔یعنی متقدمین،متوسطین اور متاخرین کی قسمیں تشکیل دی گئی ہیں۔مگر اس ترتیب میں بھی جدت طبع کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔یعنی یہ ترتیب و تقسیم کہیں زمانی اعتبار سے ہے۔کہیں موضوعاتی اعتبار سے اور کہیں حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔اسی طرح نمونہ کلام میں اشعار کے انتخاب میں بھی تذکرہ نگاروں کے ذاتی مذاق سخن کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔اور شعراء کے ذاتی نمائندہ رنگ و رجحان کا کم ہی خیال رکھا گیا ہے۔اسی لیے ان تذکروں میں اچھے برے اور درمیانی درجے کے رنگارنگ اشعار نظر آتے ہیں۔

یہ تذکرے مختلف النوع فکر و نظر کے افراد سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔ان میں شاعروں کی صورتوں میں نقوش اور سیرت و کردار کی نیرنگیاں ہمیں یکجا نظر آتی ہیں اور ان کے مزاج سے بھی خاصی حد تک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی سیاسی، سماجی،تہذیبی اور تمدنی کیفیات سے بھی کافی حد تک روشناسی ہوتی ہے اور ہم ان اشارات کی مدد سے کسی بھی دور کے شاعر کے متعلق جان سکتے ہیں کہ وہ کسی حد تک اپنے عصری حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اسے اپنے شعر و سخن میں سموتا ہے۔نیز ماہ و سال کے تعین سے شعراء کے عہد اور ان کے معاصرین کے متعلق پتہ چلتا ہے۔

ان تذکروں کی ایک خصوصیت شعراء کے کلام پر تاثراتی تنقید ہے۔یعنی شاعروں

کے کلام کی معنوی حیثیت کے بجائے لفظی حیثیت یعنی صنائع لفظ یا معنوی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ شعر کی بندش، الفاظ کی نشست و برخاست، باریکی خیال، تشبیہہ و استعارہ کی نفاست و نزاکت اور برجستگی وغیرہ کی تعریف ہی میں بیانات ملتے ہیں۔ کیونکہ یہی اندازِ تنقید اس دور کا مجموعی رنگ ہے۔اسی طرح ایک نمایاں چیز جو ان تذکروں میں ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں بالعموم تنقیص کا پہلو کم ہی نظر آتا ہے۔ ہر شاعر کو اچھے الفاظ اور اچھے انداز میں یاد کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کی سیرت کی خامیوں کی طرف نظر نہیں کی جاتی۔ معاصرین کے لیے دعائے خیر اور زندگی کی دعا کی جاتی ہے۔ جبکہ فوت ہو جانے والوں کے لیے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ اسی طرح کلام کی خوبیاں ہی بیان کی جاتی ہیں اور اختلاف کی صورت میں تہذیب و لحاظ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ تذکروں میں بالعموم گہرے تنقیدی خیالات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں ادبی تنقید کی داغ بیل انہی تذکرہ نگاروں نے ڈالی ہے پھر بھی ان میں کسی شاعر یا اس کے کلام کے بارے میں مفصل تنقیدی رائے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ کلام کی اچھائی یا برائی کے متعلق مختصراً ایسی باتیں ضرور مل جائیں گی جنہیں تنقیدی نقوش و اشارات کہا جا سکتا ہے۔مگر یہ تنقیدی اشارات کلام کی ظاہری و لفظی صورتوں ہی سے بحث کرتے ہیں۔ اور کلام کی معنوی خصوصیات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی لیکن اس انداز تنقید پر اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ جس ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں یہ تذکرے لکھے گئے۔ اس میں عربی، فارسی شاعری اور تنقید کے زیر اثر کلام کی ظاہری صورت ہی کو اہمیت دی جاتی تھی۔ موضوع، مواد یا معنوی خصوصیات کی طرف کم دھیان دیا جاتا تھا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''لفظوں اور محاوروں کے استعمال میں احتیاط اور اظہار کو بہتر اور مؤثر بنانے کی کوشش ہی اس دور کے تنقیدی معیار تھے۔ کوئی شعر پسند آیا تو اس پر واہ کہہ دی

اور اگر اس میں کوئی لفظی سقم یا محاورو زبان کا غلط استعمال نظر آیا تو اس پر اعتراض

کر دیا۔‘‘ (20)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس وقت تذکروں کا تنقیدی لب ولہجہ ہیئت الفاظ اور علم بیان و بدیع کے لوازم سے سجا ہوا تھا۔ اسی لیے ان تذکروں کی تنقیدی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے لفظی تنقید کے ان اصول وضوابط کو سامنے رکھا ہوگا جو اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مروج کئے۔ ان تنقیدی اصولوں کی ایک جھلک میر تقی میر کے تذکرے ’’نکات الشعراء‘‘ میں بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق نکات الشعراء میں جن تنقیدی اصولوں پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ ان میں ربط کلام، خوش فکری، تلاش لفظِ تازہ، صفائی گفتگو، ایجاد مضامین، تہہ داری، دردمندی، طرز خاص شامل ہیں۔ ان اصولوں کی پاسداری تقریباً ہر تذکرہ نگار کے ہاں نظر آتی ہے۔ ہر چند ان اصولوں پر مفصل بحث نہیں کی گئی اور نہ تذکروں میں اس کی گنجائش تھی لیکن اشارات کی صورت میں یہ جگہ جگہ ملیں گے۔

یہ تمام خصوصیات جو دراصل غزل سے خاص طور پر متعلق ہیں۔ شاعری کی بھی بنیادی خصوصیات سمجھی جا سکتی ہیں۔ قدیم ادب کے کارنامے ادبی صنعت کے معیار ہی سے جانچے جاتے تھے۔ صنائع لفظی و معنوی ہی کسی شہہ پارے کی پرکھ میں پیش نظر رہتے تھے۔ لفظوں کی بندش، ترکیبوں کی چستی اور عروض کے قواعد کی پابندی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ وسیع سے وسیع خیالات کو دو مصرعوں کے اندر ادا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ صنائع لفظی کا خیال رکھنا، انہیں بہتر سے بہتر طریقے سے استعمال کرنا، ترنم، آہنگ اور دوسرے قاعدوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوب صورت شعر کہنا ہی صاحب قدرت شاعر کی پہچان تھی۔ لفظ و معنی کی مطابقت قائم کرکے اپنا ایسا خاص انداز بنانا کہ دوسرا اس کی نقل نہ کر سکے۔ نیز وہ اپنے اس انداز میں ہر طرح کا خیال آسانی

سے بیان کر سکے تو اسے ہی صاحب طرز شاعر سمجھا جاتا تھا۔ پرانے دور میں شاعر نقاد بھی تھا۔ وہ اپنے اور دوسرے شاعروں کے کلام کو تنقیدی نظر سے جانچتا تھا۔ تشبیہہ واستعارہ کی خوب صورتی، مختلف صنعتوں کے استعمال کی خوبی اور خیال کی گہرائی کو دیکھا اور پرکھا جاتا تھا۔ تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں جب کسی شاعر کی تعریف کرتے تو ان تمام باتوں کا خیال رکھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''۔۔۔شعرائے اردو کے تذکروں میں جو تنقیدی اشارات کے اصول کارفرما نظر آتے ہیں وہ بے وقعت نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ اگر کوئی شخص اس نقطہ نگاہ سے قدیم تذکروں کا تفصیلی مطالعہ کرے گا تو صرف یہی نہیں کہ یہ تذکرے اپنے وقت کے مذاق سخن اور طرز تنقید کے نمائندے نظر آئیں گے۔ بلکہ ان کی قائم ودائم تنقیدی اہمیت کا اعتراف بھی کرنا ہوگا۔'' (21)

ان تذکروں میں بہت سی قیمتی معلومات بھی ملتی ہیں۔ جو ان کے اپنے دور سے متعلق ہے۔ یا پھر شعراء کی زندگی اور کلام کے بارے میں ہیں۔ مگر ان معلومات کا معیار بہت اعلیٰ درجے کا نہیں ہے کیونکہ جو معلومات ہمیں ان تذکروں میں ملتی ہیں، ان کے بارے میں سو فیصد یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون سی معلومات مستند ہیں اور کون سی غیر مستند ہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ تذکرے اس دور سے تعلق رکھتے تھے جب ایک انسان دوسرے انسان سے جڑا ہوا تھا۔ یعنی یہ دور اجتماعی زندگی اور مجلسی طرزِ زندگی کا دور تھا۔ صرف زبانی سند و گواہی کا حد درجہ اعتبار کیا جاتا تھا، کسی بیان کی تصدیق کے لیے تحریری شہادت و گواہی کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ رشید حسن خان کے مطابق:

''مزاجاً ہم لوگ روایت پرست ہیں ارو دعوے کے بغیر چیزوں کو بہ آسانی مان لینا قومی مزاج سا بن کر رہ گیا ہے۔ تصوف نے اس کمزوری کو بہت بڑھاوا دیا ہے

اور خوش عقیدگی سے اس کو موسوم کرنا سکھایا۔ سوال، جواب، جرح، و تعدیل، اسباب کی تلاش اور منطقی اندازِ نظر کو گمراہی کا مرادف بتایا گیا اور زود یقینی کو اچھی چیز سمجھا جانے لگا، خاص طور پر پرانے لوگوں اور پرانے واقعات کو تقدس کے حصار میں گویا محفوظ کر دیا گیا۔ روایتوں کو حقیقتوں کا ہم معنی سمجھ لینا قومی مزاج سا بن گیا ہے۔"(22)

اسی لیے کسی شاعر کے سالِ ولادت اور سالِ وفات کے بارے میں زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی یا دیگر اہم واقعات جو اس کی زندگی میں پیش آئے تھے۔ ان کے سنین کی طرف بھی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ یا پھر ان کی اہمیت کو سمجھے بغیر انہیں نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس دور میں شخصی کمالات کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعر کی ذات اور اس کے ذاتی حالات کو کم اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے تذکرہ نگار بالعموم کسی شاعر کی شاعری اور اس کے فن ہی کی تعریف یا تنقیص کرتے تھے، اس کی ذاتی خامی یا برائی کو اول تو نظر انداز کر دیتے تھے یا پھر نرم دھیمے انداز میں اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ رواداری اور مروّت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بشری کمزوریوں سے چشم پوشی کرنا اس دور اور معاشرے کی تہذیب تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ تذکرہ نگاروں نے تذکروں میں پیش کردہ معلومات کے لیے بیاضوں سے مدد لی ہے۔ جن میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان ذاتی بیاضوں میں صرف شاعروں کا نام اور کلام کا انتخاب درج ہوتا تھا۔ اسی لیے اٹھارہویں صدی کے تذکرہ نگاروں نے تذکروں میں کسی شاعر کے متعلق جب کچھ بھی لکھا ہو کسی بیاض، ذاتی یادداشت یا پھر مجلسی معلومات پر بھروسہ کر کے لکھا اور اپنے ماخذ کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ نیز انتخابِ کلام کے بارے میں بھی زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے تذکروں میں بھی اسی نوعیت کی خامی نظر آتی

ہے۔اس دور کے تذکروں میں دستاویزی اور مطبوعہ شہادتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود بہت سے غیر مستند اور غیر معتبر اندراجات بھی ملتے ہیں اور جو مواد جہاں سے میسر آیا، اس کی صحت پر توجہ دیے بغیر اسے قلم بند کر لیا گیا۔ مثلاً علی جواد زیدی نے اپنے مضمون ''تاریخ ادب اردو کی تدوین'' میں مصحفی کی مثال دی ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اپنے ہم عمروں کی تخمینی عمر بتا دیتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ یہ تذکرہ کئی سالوں تک لکھتے رہے۔ اس لیے یہ متعین کرنا بہت مشکل ہے کہ کس کا تذکرہ کس سال میں لکھا گیا۔ ان بیانات کو درست تسلیم کرنا یا سند کا درجہ دینا ممکن نہیں۔ اس خامی کے باوجود یہ بات بھی اہمیت کے حامل ہے کہ ان میں سے بیشتر تذکروں سے ہمیں شاعری کے تاریخی ادوار کا علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قائم چاند پوری کا تذکرہ ''مخزنِ نکات'' سے ہمیں شعراء کے تین ادوار کا علم ہوتا ہے۔ یعنی اس تذکرے میں شعراء کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح میر حسن کا تذکرہ ''تذکرہ شعرائے اردو'' یا قدرت اللہ شوقی کا تذکرہ ''طبقات الشعراء'' ان سب میں شعراء کی یہی تقسیم کی گئی ہے۔ کہیں کہیں تذکرہ نگاروں نے تقدیم و تاخیر کا صحیح طرح سے خیال نہیں رکھا۔ مگر اس خامی کے باوجود اس تقسیم سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ہمیں موجودہ دور میں ان شعراء کے دور کو متعین کرنے میں بہت حد تک آسانی ہو جاتی ہے۔ مگر ایک ادبی مورخ اس وقت ضرور پریشان ہو جاتا ہے جب ایک ہی شاعر کے متعلق معلومات اور اس کے حالات کے ضمن میں سنین مختلف تذکروں میں مختلف ملتے ہیں۔ اس وقت اس کو احتیاط اور چھان بین کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تا کہ درست معلومات تک پہنچا جا سکے۔

تذکروں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان میں ماخذ کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ اسی لیے ایسی بہت سی باتیں جو سینہ بہ سینہ روایت کے طور پر چلی آتی ہیں مگر جن کی تاریخی حیثیت مشکوک ہوتی ہے وہ ان تذکروں میں جگہ پا جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام کمزوریوں کے

باوجود بھی ادبی تاریخ نگاری کے خاطر ان تذکروں کونظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ دیگر مواد کی عدم دستیابی ہمیں ان تذکروں کی مدد لینے پر مجبور کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''اردو میں ادبی تنقید وسوانح اور تاریخ نگاری کے سلسلے کا تحقیقی کام دراصل تذکروں کے سہارے آگے بڑھا ہے۔ اگر یہ تذکرے یکے بعد دیگرے سامنے نہ آتے تو ہم اردو زبان وادب کے قدیم ورثے، اس کی نوعیت، اس کے اسالیب اور اسالیب کی ارتقائی کڑیوں سے ناواقف ہوتے۔'' (23)

اٹھارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کے تمام تذکروں میں یکساں اسلوب نہیں ملتا۔ ان دونوں صدیوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ رنگ و انداز ضرور ان تذکروں میں نظر آتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھے جانے والے تذکروں میں اجمال اور اختصار کا رنگ ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں بالعموم سو سے زائد شعراء کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان تذکروں پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ کیونکہ یہ تذکرے ایک تو فارسی زبان میں لکھے گئے یا ان میں فارسی روایت رنگ اپنایا گیا ہے۔ بہ لحاظ مواد و موضوع ان میں تنوع نہیں ہے۔ اکثر تذکرے جوابی تذکروں کی صورت میں لکھے گئے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اپنے معاصر تذکروں کو بطور مآخذ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں یہ تذکرے ادبی گروہ بندیوں سے خالی نہیں ہیں۔ میر تقی میرؔ کے تتبع میں لکھے جانے والے تذکروں میں ان کے تذکرے ''نکات الشعراء'' کا رنگ خاصا نمایاں ہے۔ جبکہ ان کے مخالف تذکروں میں ایک الگ ہی سوچ اور رنگ نمایاں ہے۔

انیسویں صدی کے تذکرے فارسی روایت سے ہٹ کر الگ ایک نئی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ اس عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی تذکرے لکھے گئے۔ مرزا

علی لطف کا تذکرہ ''گلشنِ ہند'' اردو زبان میں شعراء کے تذکروں کی روایت کا اولین نمونہ ہے۔ اس کے بعد کئی تذکرے اردو زبان میں نظر آنے لگے۔ اس دور کے تذکروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قدیم تذکروں کی طرح اختصار سے کام لینے کے بجائے تفصیل اور طوالت کا سہارا لیا ہے۔ شعراء کے سوانح حالات پر زیادہ زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور دستاویزی شہادت کا اہتمام بھی ملتا ہے۔ واقعات و حالات کی سچائی کی تحقیق و جستجو ان تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے اکثر تذکروں میں زبان کے آغاز و ارتقاء پر مضمون ملتے ہیں۔ الغرض ان تذکروں کی یہی خوبی اہم ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ لکھنے والوں کی سوچ۔ رنگ ڈھنگ اور اظہار بیان کا انداز بھی بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اردو تذکروں میں شعراء کا تعارف ان کے مختصر حالات، انتخاب کلام اور اس پر تبصرہ نظر آتے ہیں۔ ادبی تاریخ میں بھی یہ سب باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس لیے تذکروں کو تاریخ ادب کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ان تذکروں میں کہیں کہیں قدیم و جدید ادوار اور اسلوب شعر کی تبدیلیوں کا شعور مجمل اشارات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مثلاً بعض تذکروں کے آغاز دیباچے یا مقدمے میں زبان کی ابتداء اور اس کی تدریجی ترقی کا کچھ نہ کچھ حال متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے عنوان سے قائم کیے۔ تاریخی طور پر ان کے باشعور ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ تاریخ ادب تاریخی ترتیب سے ادب کے مشاہیر کا ذکر کرتی ہے۔ اس میں زبان و ادب کے ارتقاء کا زمانی جائزہ لیا جاتا ہے اور ہر شاعر و ادیب کا درست زمانہ، مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ تذکرے میں صرف شعراء کی ترتیب قائم کرتے ہوئے کسی حد تک تاریخی ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شاعر کو اس کے صحیح مقام و مرتبے پر ہی رکھا جائے۔ ضخیم تذکروں میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے شاعر کا ذکر

کر دیا جائے تا کہ ان کا ذکر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جائے۔اسی طرح تاریخ ادب میں بھی نامور مشاہیر کے ساتھ ساتھ گم نام مصنفین اوران کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ ادب کی تاریخ میں وہ زندہ رہیں اوران کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔

تذکرہ نگار جن شعراء کا ذکر کرتے ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کرتے وقت خاص تحقیق وجستجو سے کام نہیں لیتے۔سنی،سنائی روایات کا بیان ایک عام سی بات ہے۔اس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ بہت سی غلط باتیں سند کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔جبکہ ادبی تاریخ میں واقعات پیش کرتے وقت تحقیق وجستجو سے کام لے کر واقعات کو حالات کی اصل صورت اور درست سنین کی تلاش پر زور دیا جاتا ہے۔ادبی تاریخ میں قدم قدم پر دلائل پیش کرنا بہت ضروری سمجھتا ہے۔اور کسی بھی واقعے کے بارے میں اپنے ماخذ کی نشاندہی کرنا بھی ایک ضروری امر ہے،مگر تذکروں میں ان چیزوں کی طرف کم ہی غور وفکر کرتی ہے۔

تذکرہ نگاری کی حدود ادبی تاریخ کی طرح وسیع نہیں ہے۔شعراء کے مختصر سوانح حالات،کلام پر سرسری تبصرہ اور اشعار کا انتخاب،تذکرے کی فنی خوبیاں ہیں۔تذکرہ نگار اسی محدود دائرے میں اپنا جوہر دکھاتا ہے۔تذکرہ نویس کا ذاتی وشخصی اسلوب ہی تذکرے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتا ہے۔اردو ادب میں تاریخ نگاری ابتداء ہی سے تذکروں کی مرہون منت رہی ہے۔ادبی مورخین بنیادی ماخذ کے طور پر آج بھی تذکرے کی پیروی کرتی ہیں۔اور اپنے اپنے انداز وقیاس کے مطابق تذکروں میں چھپی ہوئی معلومات کو تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے۔ قدیم شعراء کے کلام کے نمونے اگر دیکھنا ہو یا ان شعراء کے سوانح کی جھلکیاں دیکھنا ہوتو مورخین کوانہیں تذکروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔چند تذکروں میں ادبی تاریخ نویسی کا رنگ نظر آتا ہے۔اس میں گارسین دتاسی اور کریم الدین احمد کے تذکرے نمایاں ہے۔شعراء وادبا کا سوانحی

تعارف، کلام کا سرسری جائزہ اور زبان وادب کا تاریخی جائزہ یہ تین عناصر تذکرہ نگاری کی جان ہوتی ہے۔ابتدائی ادبی تاریخوں میں بھی یہ رنگ غالب نظر آتے ہیں۔

تذکروں میں زبان وادب کے حوالے سے بہت سے مفروضات اور سنی سنائی باتیں موجود ہیں۔ابتدائی تاریخ نویسوں نے ان خیالات اور مفروضات کو اپنی تاریخوں میں جگہ دی ہے۔مگر ان کے متعلق گہری تحقیق کر کے اصل حقیقت دریافت نہیں کی۔اس وجہ سے بہت سے مفروضات اصل حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے۔مثلاً: ولی کو ایک عرصے تک اردو غزل کا باوا آدم سمجھا جاتا رہا۔اور امیر خسرو سے متعلق غلط معلومات اور بعض اشعار ادبی تاریخوں کا حصہ بن گیا جن کی اصلیت کی کوئی واضح سند موجود نہیں تھی۔

تذکروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کا تاریخی مواد صرف شعراء کے حالات زندگی یا ان کے کلام پر تنقید وتبصرہ تک محدود نہیں ہے بلکہ مختلف اشاروں کی صورت میں ادبی تحریکوں، روایتوں، شعری محفلوں، سماجی اور اخلاقی قدروں کا بھی ذکر ملتا ہے، جس سے ان تذکروں کے اپنے عہد کی شاعرانہ فضا واضح ہوتی ہے۔ادبی تاریخوں میں ان معلومات کا رنگ اور بھی نکھر کے سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر سید محمد عبداللہ شعرائے اردو کے تذکرے میں تذکروں کی خوبیاں گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان تذکروں میں ادبی وعلمی حلقوں کے مشاغل اور تفریحوں کا حال، ان کی رقابتیں اور کش مکش، وضع داریاں اور پاس داریاں، باہمی سلوک ومراعت اور ان کے ردو قبول اور پسند وناپسند کے معیار، غرض سارے نظام معاشرت کا روشن تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔بلاشبہ یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی بڑی قابل قدر یادگاریں ہیں۔ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' (24)

قدیم وجدید ادوار، عہد بہ عہد لسانی وادبی ارتقاء پر مفصل اور مربوط تبصرے واضح طور پر ان تذکروں میں نظر نہیں آتے۔ میرؔ کا تذکرہ نکات الشعراء میں اردو زبان اور شاعری کی ابتداء اور نشو ونما کے بارے میں بہت سی مفید اور دلچسپ معلومات مہیا ہوتی ہیں اور تقریباً سبھی مورخین نے ان معلومات سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

تذکروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں اصلاحِ زبان کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ تذکرہ نگار شعراء کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہیں کہیں ان کی تصحیح بھی کرتے ہیں۔

حوالہ

1. اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:17
2. اردو تذکرہ نگاری 1835ء کے بعد، ڈاکٹر نیاز سلطان پوری۔ ص:19
3. اردو تنقید پر ایک نظر، پروفیسر کلیم الدین احمد، ص:19
4. مضمون: فنِ تذکرہ نگاری اور تنقیدی رجحانات، تنویر احمد علوی۔ مشمولہ مشرقی شعریات اور اردو تنقید کا ارتقا۔ جلد۔3
5. اردو تذکرہ نگاری 1835ء کے بعد، ڈاکٹر رئیس احمد، ص:43
6. شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:11
7. نکات الشعراء کا تنقیدی مطالعہ، بحوالہ ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:308
8. تذکرہ نکات اشعراء، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، ص:15
9. مقدمہ نکات الشعراء، عبادت بریلوی، ص:22
10. نکات الشعراء کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:308
11. تذکرہ میر تقی و میر حسن، مولوی عبدالحق، ص:44-45
12. تاریخ ادب اردو جلد دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:774
13. شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:43
14. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:211
15. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:305
16. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:306
17. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:364
18. اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:36
19. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،
20. ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:312
21. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:85
22. ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان، ص:115
23. اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پیش لفظ ص:1
24. صلاح الدین احمد تعارف، ص: ز، مشمولہ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

آب حیات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

محمد حسین آزاد نظم جدید کے موجد، انشا پرداز اور صاحبِ طرز کی حیثیت سے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مہدی افادی کا خیال ہے کہ آزاد کی انشا پردازی، اخلاق، سوانح، اور تاریخ کسی بھی حوالے کے بغیر اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہے۔شبلی کا قول ہے کہ آزاد گپیں ہانکتے ہیں تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ وہ دلّی کالج کے پروردہ، عربی و فارسی زبان وادب کے پروفیسر، فارسی اور اردو زبانوں کی ادبی تاریخ لکھنے والے، ذوق کے شاگردِ خاص اور دلّی میں اردو کے پہلے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کے مدیر مولوی محمد باقر کے صاحب زادے ،اتنی فضیلتوں کے ساتھ محمد حسین آزاد کی پہلی اور اصل فضیلت زبان اردو میں ایک علاحدہ طرزِ نگارش اور دبستان کے موسس کی ہے۔

آزاد نے کئی نا قابلِ فراموش کتابیں تحریر کیں۔'دربارِ اکبری'، 'سخن دانِ فارس'اور 'نیرنگِ خیال' لیکن جس کتاب نے انھیں زندہ جاوید مصنفوں کی صف میں لا کھڑا کیا وہ آب حیات ہے۔انھوں نے اردو زبان کا آغاز ،عہد بہ عہد ترقی اور اردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ لکھی ہے۔اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ہر دور کے مزاج وخصوصیت کو اجاگر کیا ہے۔شاعروں کی سیرت کا خاکہ بڑی عمدگی سے کھینچا ہے۔ان کی شاعری پر نقد وتبصرہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ آب حیات معلومات کا ایک بیش قیمت خزانہ بن گیا۔

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کی تحریر کا ایک مکمّل خاکہ تیار کیا۔اس سے پہلے وہ تاریخ کی مقصود بالذّات کتابیں'سخن دانِ فارس'اور 'دربارِ اکبری' لکھ چکے تھے۔اسی لیے آبِ حیات کو اُنھوں نے ایک واضح تاریخی خط پر آگے بڑھایا۔ ابتدائی حصّے میں 'دیباچہ'، 'تاریخِ

زبانِ اردو'اردو کی وجہ تسمیہ'،'برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کیے'اور 'نظمِ اردو کی تاریخ' کے عنوانات سے ایک طویل مقدمہ لکھا۔ انھوں نے پوری ادبی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا۔ وَلی سے یہ تذکرہ شروع ہوکر میر انیس تک پہنچتا ہے۔ دکن، دہلی، اور لکھنؤ کے کُل ۲۹ شعرا کے بارے میں محمد حسین آزاد کے خیالات اس کتاب میں موجود ہیں۔ حسبِ ضرورت وہ اختصار یا تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں اہم شعرا کو آبِ حیات میں مفصّل تذکرے کا حصّہ بنایا گیا ہے لیکن بعض مواقع سے اُنھوں نے اہم شاعروں کو ضمنی تذکرے کے لائق سمجھا اور اُن سے کم مرتبہ شعرا درجنوں صفحات پر اپنے واقعات کے ساتھ موجود ہیں۔

آبِ حیات کے اوّلین دور دہلی میں اردو شاعری کی ابتدا کے لیے وقف ہیں۔ وَلی اور اُن کے دیوان کے دہلی آنے سے یہ تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اولین دور کے شعراء میں مبادک آبرو، شرف الدین مضمون، شاکر ناجی، محمد احسن احسن اور مصطفی وغیرہ۔ ایہام گو شعرا اور اصلاحِ زبان کے موئدین تک انجام کو پہنچتا ہے۔ آبِ حیات کے یہ ادوار اصل میں تیسرے دور کی پیش بندی ہیں۔ جس میں محمد حسین آزاد نے مرزا محمد رفیع سودا، محمد تقی میر، میر سوز، خواجہ میر درد کے ساتھ مرزا مظہر جانِ جاناں، میر ضاحک اور عبدالحئی تاباں کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ یہی اردو شاعری کا عہدِ زرّیں ہے۔ آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ یہ لوگ ''حقیقت میں عمارتِ اردو کے معمار ہیں۔'' اپنے مخصوص انداز میں اُنھوں نے اس دور کے شعرا کے بارے میں کچھ چمکتے ہوئے جملے بھی لکھے ہیں۔ ملاحظہ کریں:۔ ''اس مشاعرے میں اُن صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے،..... ''تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اُتاریں گے''۔

آبِ حیات کا چوتھا دور اُن شعرا پر مشتمل ہے جنھیں دہلی سے لکھنؤ تک اپنی فضیلت

ثابت کرنے کے مواقع ملے۔ ان میں سے سب حلقۂ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں کے تربیت یافتہ ہیں لیکن ان کی شہرت اور نام وری کا سورج لکھنؤ میں جا کر چمکا۔ جرأت، انشا، مصحفی اور میر حسن چار شاعروں کا دورِ چہارم میں ذکر ہے لیکن جہاں انشا اللہ خاں انشا کو ۴۸ صفحات میسّر آئے ہیں وہاں میر حسنؔ کے لیے محض ۵ صفحات عطا کیے گئے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن ۵ صفحات میں بھی آزاد نے ایسی خدا لگتی کہی کہ آج تک اُنھیں صفات کو میر حسن کا بنیادی وصف مان لیا جاتا ہے۔

آبِ حیات کا سب سے تفصیلی دور دورِ پنجم ہے جس میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے انیسویں صدی کے تمام بڑے شعرا موجود ہیں۔ غزل، مرثیہ اور قصیدہ جیسی اصناف کے عظیم خدمت گار اس دور میں پیش پیش ہیں۔ ناسخ، خلیق، آتش، شاہ نصیر، انیس، دبیر اور حکیم مومن خاں مومن کے ساتھ ساتھ غالب اور محمد حسین آزاد کے استادِ گرامی خاقانِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق جیسے ۹ شعرا آبِ حیات کے پانچویں دور میں شامل ہو کر اردو شاعری کے تذکرے کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ یہی دور ہے جہاں آزاد نے اپنے استاد کے لیے عقیدت کے تنقیدی پھول نچھاور کیے جس کے سبب قیامت تک اُن پر ادبی بے انصافی کا جرم ثابت ہوتا رہے گا۔ مومن اور انیس کی قدر و قیمت پہچاننے میں بھی آزاد نے ٹھوکر کھائی ہے اور غالبؔ کے ساتھ اُنہوں نے جو کیا، وہ اردو کی ادبی تاریخ کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔

آبِ حیات کی تنقیدی اور تحقیقی اہمیت خاصی نزاعی رہی ہے۔ اگر قاضی عبدالودود کی کتاب ''محمد حسین آزاد بہ حیثیت محقق'' کے مشتملات پر یقین کریں تو آزاد کو تحقیق کا مردِ میداں کہنا ممکن نہیں۔ کلیم الدین احمد نے .... ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں آبِ حیات کا جو مختصراً جائزہ لیا ہے، اُس کی روشنی میں یہ تاریخ اور تنقید کی کتاب نہیں بلکہ تذکرہ ہے۔ تنقید و تحقیق دونوں

شعبوں کے جو بڑے دانش وَر ہوئے، اُن میں سے اکثر آبِ حیات کی تنقیدی اہمیت پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ آبِ حیات کی تنقیدی و تحقیقی فروگذاشتیں اور غیر ناقدانہ انشا پردازی اپنی جگہ لیکن اس کتاب میں محمد حسین آزاد کے تنقیدی ذہن کی واضح گونج سنائی دیتی ہے اور محض اس کتاب کے مشتملات کی روشنی میں آزاد کی شخصیت میں موجود اُس عظیم تنقیدی شخصیت کو پہچانا جا سکتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے پانچوں ادوار کی جو تمہید لکھی ہے اُس کے چند جملوں میں اُن کا تنقیدی ذہن اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ غلط فہمی ہوگی کہ ہم اُنہیں نِرا انشا پرداز تصور کر بیٹھیں۔ دورِ اوّل کے بارے میں یہ کہنا کہ ''اِن بزرگوں کے کلام میں تکلّف نہیں، جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دِل میں خیالات گزرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں''۔ دوسرے دور کے تعارف میں یہ کہنا کہ ''زبان کے حُسنِ قدرتی کے لیے موسمِ بہار ہے'' اور اس زمانے کے شاعروں کے بارے میں یہ بیان کہ ''خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے''؛ آزاد کے بہترین تنقیدی ذہن کی مثالیں ہیں۔ تیسرے دور کے بارے میں آزاد کا تمثیلی انداز ملاحظہ ہو: ''زبانِ اردو ابتدا میں کچّا سونا تھی، ان بزرگوں نے اُسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج وافسر تیار ہوتے ہیں۔'' میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے شاعروں کو اس سے زیادہ بہتر کس طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

آبِ حیات کے چوتھے دور کی تمہید یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ آزاد اِن سے زیادہ توقع نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: ''ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طراریِ طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دَبے گی مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے۔'' آزاد واضح

طور پر لکھنؤ اسکول کے شاعروں پر اعتراض کررہے ہیں۔ اسی طرح پانچویں دور کے بعض شاعروں کی نام نہاد بلند پروازی پر نشانہ سادھتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارہ ہوجائے گا اور بعض ایسے اڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔'' اسی تمہید میں روایتی اور جدید ذہن کے شعرا کا فرق جس طرح محمد حسین آزاد نے واضح کیا ہے، یہ کسی معمولی تنقیدی ذہن کے آدمی سے ممکن نہیں تھا۔

محمد حسین آزاد کے تنقیدی ذہن کی پرکھ شعرا کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بھی ہوتی ہے۔ یہ اعتراض بجا کہ اُنہوں نے غالب کے ساتھ انصاف نہیں کیا، مومن کو صحیح تناظر میں نہیں پرکھا اور میر حسن جیسے شاعر کو چند صفحات میں سمیٹ دیا۔ لیکن اس کے باوجود بعض شعرا کے بارے میں اُن کے تاثرات اب بھی سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اکثر شعرا کے بارے میں جو ادبی رائے محمد حسین آزاد نے قائم کی ہے، اُسے پورے طور پر آج بھی قبول کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ ولی کے بارے میں آزاد نے لکھا: ''دنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں''، ولؔی کی زبان کی خوبیوں پر اس سے لطیف اشارہ اور کیا ہوگا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے تعارف میں آزاد نے واضح کردیا کہ میرؔ اور سوداؔ کے ساتھ اِن کا نام شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ زبان کی اصلاح کی کوششوں کے سبب لیا جارہا ہے۔ سوداؔ کے بارے میں محمد حسین آزاد نے کہا: ''اُن کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکتِ مضمون میں عرفی اور ظہوری کو شرماتا ہے۔'' آزاؔد ذوقؔ کے شاگرد ہیں اور تعریف کے لفظ اور محاورے بھی اپنے استاد کے لیے انھیں بچا کر رکھنے ہیں۔ اس کے باوجود سوداؔ کے بارے میں یہ کہنا ''جن اشخاص نے زبانِ اردو کو پاک صاف کیا ہے، مرزاؔ کا اُن میں پہلا نمبر ہے'' اُن کی اعلا تنقیدی صلاحیتوں کا اعلان نامہ ہے۔

میرؔ کی شاعری کے بارے میں محمد حسین آزاد نے جوسب سے بڑی خوبی واضح کی، وہ اُن کی تاثر آفرینی ہے۔آج میرؔ کے ناقدین متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ میرؔ کے اشعار میں متاثر کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔اسی طرح حالاں کہ میرحسن کوسرسری مطالعے کا حصّہ بنایا لیکن اُن کی جوخوبی اپنی انشا پردازی کے بَل بوتے پر پیش کی ہے، اُس کی کوئی دوسری تنقیدی مثال دوصدیوں میں نہیں دکھائی دیتی ہے۔میرحسنؔ کی مثنوی کی زبان کے بارے میں محمد حسین آزاد نے واقعتاً خدالگتی کہہ دی تھی: ''کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ اُس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔'' اردو کے کس تنقید نگار نے میرحسن کی خدمات کا اتنی گہری تنقیدی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔غالب کے ساتھ بے انصافی قابلِ معافی نہیں لیکن اُن کی معنی آفرینی اور نازک خیالی کو آزاد نے بنیادی شاعرانہ صفت تصور کیا ہے۔خطوط نگاری پر آزاد نے چند سطریں لکھی ہیں لیکن ہم آج جس طرح اُن کے مکاتیب کی اہمیت کو جانتے ہیں اُس کی بنیادی منطق آبِ حیات میں موجود ہے۔

آبِ حیات تنقیدی سے زیادہ تاریخ ہے اس کے پہلے اردو میں شعر و ادب کی باضابطہ تاریخ لکھنے کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا ہے۔عہد بہ عہد جوتبدیلیاں ہورہی تھیں اورمختلف زمانے کے لکھنے والوں میں خطِ امتیاز کس طرح کھینچا جاسکتا ہے، اِن امور پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی تذکروں سے زیادہ رہنمائی نہیں ملتی۔آبِ حیات اس اعتبار سے پہلی کتاب ہے جہاں تاریخ وار شعروادب کے ارتقا کی سمت ورفتار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ولیؔ کی آمد دہلی سے اُنیسویں صدی میں دلّی اورلکھنؤ کے معروف شعرا تک،تقریباً دوسو برسوں کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے آزاد نے کوشش کی ہے کہ ادبی رویّوں کے بدلتے مناظر کو پیش کیا جائے۔ایک ادبی تاریخ نگار کے طور پر آزاد مختلف عہد کے شعرا کے درمیان خوبیوں اور خامیوں پر خصوصیات کو اجاگر کرنے

میں کامیاب ہیں۔ آزاد کی باریک بیں نگاہ کا اسے کمال سمجھنا چاہیے کہ پہلے اور دوسرے دور کے شعرا میں حالاں کہ زمانی فصل نہیں تھا لیکن ادبی رویوں میں خاصا امتیاز تھا۔ محمد حسین آزاد نے اسی لیے شاکر ناجی کو اور اشرف علی خاں فغاں یا شاہ حاتم کو الگ الگ ادوار میں رکھا۔

آبِ حیات کی اہمیت اگر تاریخی ہے تو اُس کا بنیادی مرحلہ پانچویں دور میں سَر ہوتا ہے۔ دورِ پنجم کے شعرا میں سے اکثر کو محمد حسین آزاد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالبؔ اور مومنؔ کو دہلی کی ادبی محفلوں میں دیکھ چکے تھے۔ اُنہیں ایسے ہزاروں افراد سے انکا تعلق تھا جنہوں نے اُس سے پہلے کے شعرا کی محفلیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھی تھیں۔ اس طرح براہِ راست اور بلاواسطہ تعلقِ خاطر کا سلسلہ تیسرے دور کے شعرا تک چلا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے ذاتی بنیادوں پر جو اطلاعات جمع کیں اُنہیں بیان کے مرحلے میں بھی امتیاز بخشا ہے۔ آبِ حیات کا یہ حصّہ تاریخ کا وہ اچھوتا باب ہے جس کی وجہ سے آبِ حیات کی تنقیدی و تحقیقی اہمیت سے انکار کرنے والے شخص کو بھی آبِ حیات کی بزم میں اپنی ضرورت کا حال چال پتا کرنے کے لیے پہنچنا پڑتا ہے۔ انشاؔ اور ناسخؔ یا مصحفیؔ اور میرؔ یا ذوقؔ کی محفلوں کی اہمیت کیا ہے یا اُن کے حلقۂ ارادت میں پہنچنے والے کی تربیت کس طرح ہوتی تھی، اس کا نقشہ جاننے کے لیے آبِ حیات واحد ذریعہ ہے۔

محمد حسین آزادؔ کی انشا کی خوبیوں پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے یہاں ڈرامے اور داستان کے متعدد عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ کسی تاریخ نگار سے یہ توقع نہیں کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دور کے ادب کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے ایسی لفظی تصویریں بھی بنا دے کہ وہ عہد صفحۂ قرطاس پر سانسیں لیتا ہوا مل جائے۔ آبِ حیات کے صفحات گواہ ہیں کہ جہاں اپنے آپ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ زندۂ جاوید کھڑا ہوتا ہے۔ اگر آبِ حیات

جیسی کتاب نہیں لکھی گئی ہوتی تو تذکروں کی بساط نہیں تھی کہ ہمارے قدیم شعرا کی شخصیت اور ادبی سرگرمیوں کے خال وخط روشن کردیتے۔ آبِ حیات میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شعرا زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ میر کا اندازِ کلام کیا تھا یا آتش نے کسی نازک مرحلے پر کیسے تلوار کھینچ لی، یہ کسی دوسری کتاب میں ہم کہاں سے دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حسین آزاد میں محاکات نگاری کا عجب ملکہ تھا۔ ایک ماہر داستان طراز کی طرح انھوں نے شعرا کے دیکھے اَن دیکھے، سچّے اور غیر حقیقی تمام واقعات کو دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے۔ گھریلو فضا، محفلِ احباب، مشاعروں کی معرکہ آرائیاں، شاگردوں کا حلقہ اور ان کے ذریعہ ایک دوسرے سے نبرد آزمائی، ادبی اور غیر ادبی معاملوں میں لڑائیاں، دربار اور دوسرے وسائل سے تعلق ان جیسے سینکڑوں معاملوں میں آزاد نے حقیقت میں رنگ آمیزی کی جس کی وجہ سے آبِ حیات اردو کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

واقعات کو زندہ وتابندہ بنا کر پیش کرنے کی محمد حسین آزاد کی خوبی کا اندازہ وہاں سے ہوتا ہے جہاں انہوں ادیبوں اور شاعروں کی نوک جھونک یا ادبی معرکوں کو پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کو اُنہیں اِن ادبی معرکوں سے کچھ زیادہ ہی دِل چسپی معلوم ہوتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ ادبی سیاست سے اُن کے گہرے شغف کا عروج غالبؔ اور ذوق کے معاملے میں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے قدیم شعرا آپس میں کس طرح نبرد آزما ہوتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کیسے اُلجھتے تھے، آبِ حیات کے صفحات اس تفتیش کے لیے کُھلے ہوئے ہیں۔ آزاد نے شاعروں کی کچھ جوڑیاں بھی بنائی ہیں آرزو۔ مظہر جانِ جاناں، سوداؔ۔ میرؔ، انشا۔ جرأت، انشا۔ مصحفی، ناسخ۔ آتش، غالبؔ۔ ذوقؔ اور انیس۔ دبیر۔ ان شعرا کے بیان میں محمد حسین آزاد نے وقوعہ نگاری کے ممکنہ ابواب کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی، درباری زندگی اور

ادبی زندگی سب کی ایک ایک پَرت اُدھیڑ کر محمد حسین آزاد نے مخصوص رنگینیِ بیان سے جو جادو کیا ہے، وہ اردو کی ادبی تاریخ کا ایک علیحدہ باب ہے۔ یہ واقعات کسی مشہور قصّے کے اجزا معلوم ہوتے ہیں لیکن کسی بھی داستان نویس سے زیادہ پُراثر رنگ آزاد کی تحریر کا ہے۔ آزاد کے مخالفین کے لیے بھی اِس حصّے میں بہت کچھ قابلِ مطالعہ ہمیشہ رہتا ہے۔

اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں شعری زبان میں جو نمایاں فرق آ رہا تھا، محمد حسین آزاد نے اس موضوع پر جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھیں لسانیات سے بھی گہری دلچسپی تھی، اس لیے اردو کے آغاز نیز دیگر لسانیاتی مسئلوں پر بھی ضرور روشنی ڈالی۔ عربی اور فارسی کے اثرات اور مقامی بولیوں سے اردو کے تعلق کا جائزہ لیا ہے۔ 'آبِ حیات' میں تہذیب و ثقافت اور زبان کی تشکیل کا جو منظرنامہ ابھرتا ہے، وہ تکثیریت سے عبارت ہے۔ مختلف تہذیبوں، زبانوں، ادب اور آداب میں ایک میل جول کا انداز محمد حسین آزاد کا وہ لسانیاتی فلسفہ ہے جسے امیر خسرو سے لے کر نظیرا کبرآبادی تک کامیابی سے آزما چکے تھے۔ عہدِ جدید میں جب انگریزی کا طوفان اٹھا ہوا تھا اور مغربی لالٹینوں کی روشنی تیز تر ہو رہی تھی، محمد حسین آزاد نے ملے جلے لسانی معاشرے کا خواب دیکھا۔ انہی وجوہات کی بنا پر آزاد کا شمار اردو کے عظیم لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

آبِ حیات کی ہزاروں خوبیاں اپنی جگہ، محمد حسین آزاد کا بے پایاں علم سب صحیح لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ آبِ حیات کی شہرت کا دارومدار صرف آزاد کی انشاپردازی کی بدولت قائم و دائم ہے۔ اس اعتبار سے صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جانے والے صاحبِ طرز نثر نگاروں میں کون کافر ہے جو محمد حسین آزاد کو شامل نہیں کرے گا۔ ایسے ناقدین بھی موجود ہیں جو آزاد کو نثرِ مرصع کے حوالے سے پہچاننا چاہتے ہیں۔ انھیں بھی ملّا وجہی اور رجب علی بیگ

سرور کے بعد پروفیسر آزاد کی یاد آئے گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک ہی شخص کو سادہ گوئی اور مرصع کاری دونوں کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ غالب نے 'سادگی و پُرکاری' کا جو محاورہ وضع کیا اُس کا اردو نثر کی تاریخ میں محمد حسین آزاد سے بہتر نمونہ کون ڈھونڈ کر لا سکتا ہے؟

محمد حسین آزاد کی نثر بلا شبہہ ایک علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ یہ ہے واقعتاً امتزاجی نثر اور اس میں ایک ہی ساتھ سادگی اور مرصع کاری کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔ غور یہ کرنا ہے کہ یہ ناقابلِ یقین ادبی حکمتِ عملی کس طرح تیار ہوئی اور اس کا نفاذ کیوں کر ممکن ہوا؟ یہ سوال بھی اہم ہے کہ اور کسی کو کیوں نہیں اس امتزاجی نثر کی تشکیل کا خیال آیا؟ محمد حسین آزاد اس الگ انداز کے نگارخانے کو سجانے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کیوں کہ انھوں نے اپنی نثر کا بنیادی ڈھانچہ سادہ رکھا۔ اُن کی عربی دانی اور فارسی دانی کی ہزار عظمتوں کے باوجود اُن کے ہاں شاید کبھی کوئی مشکل لفظ یا مصنوعی ترکیب ملے۔ بالکل سامنے کے الفاظ اور بول چال کی زبان کو ہی انھوں نے اساس بنایا۔ اس معاملے میں میر امن اور غالب نے جو لسانی ترکیب استعمال کی تھی، محمد حسین آزاد نے اُسے مزید سہل بنا کر آزمایا۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ کیا آزاد اپنی عربی اور فارسی دانی کو بالا رادہ چھپانا تو نہیں چاہتے۔

آزاد کے اسلوبِ نگارش کی بحث میں ایک پیچیدگی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ جب انھوں نے بنیادی ڈھانچہ سادہ گوئی کا رکھا تو اس میں مرصع کاری کیسے آ جائے گی اور اگر ہے تو اُسے کہاں تلاش کیا جائے؟ اردو کے قدیم مرصع کاروں کی طرح لفظوں کی رنگینی اور بیان کے اُلجھاوے سے حُسن پیدا کرنے کا انداز، آزاد نے نہیں روا رکھا۔ اظہار کے مرحلے میں بیان کو رفعتوں سے ہم کنار کرنے کا ایک مستحکم کام آزاد نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اتفاق سے اُنھیں بہترین شعرا کا دور ملا تھا۔ شاعروں کی تاریخ لکھنے والے کے لیے تخیّل اور رومان پسندی بنیاد بن

سکتے ہیں۔محمد حسین آزاد کے یہاں عبارت میں بیان کی جو رنگینی ہے وہ لفظوں کی نہیں، عربی اور فارسی کی حاکمانہ موجودگی کی نہیں بلکہ اُس دور اور اُس دور کے بڑے اہلِ قلم کی زندگی کی تصویروں کی رنگارنگی ہے۔ اسی میں قصّہ گوئی اور تصویر سازی کی محمد حسین آزاد کی دیرینہ خواہشات بھی پوری ہوتی ہیں۔آزاد اصل میں ایک تخیلاّتی آدمی (Imaginative) ہیں لیکن اُنہوں نے فکشن میں بھی توجہ نہیں کی۔ ڈپٹی نذیر احمد ناول لکھنے لگے تھے۔آزاد اگر افسانہ یا ناول یا ڈرامے کی طرف قدم بڑھاتے تو اُن کی صلاحیت کا بہترین استعمال آزادانہ طور پر ہوسکتا تھا لیکن انھوں نے غیر افسانوی ادب کا انتخاب کیا۔شاعری کی باری آئی تو وہاں بھی موضوعات اور قومی ضرورتوں کے تقاضے اور بندھن دیوار کی طرح موجود تھے۔اس لیے ''دربارِ اکبری''، ''نیرنگ خیال'' اور آخری دور میں ''آبِ حیات'' کے صفحات پر آزاد کی وہ تخیلاّتی شخصیت زندگی بداماں نظر آتی ہے جس کے لیے بنیادی جگہ تو تخلیقی ادب تھا لیکن اتفاق سے اُس شخص کو تاریخ کے شعبے میں اپنی خدمات انجام دینی پڑیں۔اس لیے نثر کے ایک سادہ ڈھانچے میں بھی شگفتگی، رنگینی اور مرصع کاری کی تمام عشوہ طرازیاں موجود ہیں۔

آبِ حیات اپنے نام کی طرح ہی امتیازی شان رکھنے والی کتاب ہے۔اس سے پہلے اردو کی دو عظیم کتابیں بھی اسم بامسمّٰی رہی ہیں سب رس اور باغ و بہار۔محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب کا نام آبِ حیات رکھ کر لکھنے والے کی نیک خواہشات اور تعلّی کا نقطۂ عروج ڈھونڈ لیا۔ یہ سچ بھی ہے کہ آنے والا کوئی مصنف اپنی تحریر کے بارے میں آبِ حیات سے آگے کا کون سا لفظ لائے گا۔آبِ حیات کی تصنیف کے سوا سو برس گزر چکے ہیں لیکن اس کی زندگی، چمک اور روشنی میں ایک لحظہ کمی نہیں آئی۔ جیسے جیسے عہدِ قدیم سے ہم دور ہوتے جائیں گے آبِ حیات کی ضرورت اور بڑھے گی۔آج ہم نے اُسے تنقید اور تاریخ یا تحقیق کی بہترین کتاب ہونے سے

جزوی طور پر انکار کر دیا ہے لیکن کیا اُس کی تہذیبی اہمیت سے صرفِ نظر کرنا ہمارے لیے ممکن ہے؟ آبِ حیات اُردو کی ادبی تاریخ میں ایک ناگزیر وقوعہ ہے اور اسی ناگزیریت (Inevitability) میں اُس کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

اردو کی مختصر ادبی تواریخ کا اجمالی جائزہ

ا۔ تاریخ ادب اردو۔ از ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک ایسی کتاب وجود میں آئی جسے ناقدین نے پہلی باضابطہ ادبی تاریخ کہا ہے۔ یہ انگریزی زبان میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی لکھی ہوئی کتاب ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر (A History of Urdu Literature) ہے جو ۱۹۲۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں پہلی بار پورے ادب یعنی شاعری اور نثر دونوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں مرزا محمد عسکری نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ مرزا عسکری نے اس میں لفظی ترجمے سے احتراز کرتے ہوئے بامحاورہ اور نسبتاً آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اس میں انہوں نے سکسینہ کی کئی اغلاط کا درستی بھی کی ہے اور بعض مقامات پر اضافے بھی کیے ہیں۔ سکسینہ نے اصل کتاب میں شعراء اور نثر نگاروں کے نمونہ ہائے کلام شامل نہیں کیے تھے کیوں کہ ان کے مطابق مختصر اقتباسات بے فائدہ تھے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ مگر مرزا عسکری نے اپنے ترجمے میں کئی جگہوں پر اس کمی کو پورا کرتے ہوئے نمونہ ہائے کلام پیش کیے ہیں۔ اپنے سادہ مگر پر لطف اندازِ بیان، تصحیحات اور نمونہ ہائے کلام کے باعث یہ کتاب مرزا عسکری کی ذاتی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ انہی خوبیوں کے باعث آج اصل کتاب پس منظر میں چلی گئی ہے اور ترجمے نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اردو ترجمے کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کے اکثر قارئین انگریزی زبان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور اردو ادب کی تاریخ کو اردو زبان میں پڑھنا ہی زیادہ موزوں اور بہتر جانتے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق اردو ترجمہ آنے کے بعد اصل انگریزی کتاب کا مزید کوئی

ایڈیشن نہیں چھپا۔ ۱۹۵۷ء میں سکسینہ کا انتقال ہوگیا۔ دیگر اور کتابوں کے نہ چھپنے کے نقصان کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ ادب میں حوالوں، نمونہ کلام، کتابیات اور جدید شعراء کی شمولیت کی کمی رہ گئی جس کے پورا کرنے کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ اور یوں مرزا عسکری کا ترجمہ آج اردو کی ادبی تاریخیوں میں خاص اہمیت کا حامل ہے کہ جب سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد مرزا عسکری کا یہی ترجمہ ہوتا ہے۔ مرزا عسکری کے اس ترجمے کے بہت سے ایڈاشن پاک ہند میں مختلف ادوار میں چھپتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پاکستان میں، اس تاریخ کو از سرنو مرتب کر کے اپنے مقعدے کے ساتھ شائع کیا اور جدید تحقیق کی روشنی میں ترمیم و اضافے اور اغلاط کی تصحیح کی۔ ۱۹۷۸ء میں اس مرتب شدہ ایڈیشن دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس تاریخ کے تجزیے کے لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مرتب شدہ ایڈیشن کا طبع ثالی ایڈیشن ہی زیرنظر ہے۔

''آبِ حیات'' کے بعد مظہرِ عام پہ آنے والے تذکروں میں نثر نگاروں کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ تذکروں کی اس روایت کے دور میں نثر ابھی عالم طفولیت میں تھی۔ ''آب حیات'' کے پہلے باب ''زبان اردو کی تاریخ'' میں انتہائی مختصر انداز میں اردو نثر کا سرسری ذکر ملتا ہے۔ البتہ ''آب حیات'' کے تتبع میں ۱۹۲۴ء میں مولوی محمد یحییٰ تنہا کا تذکرہ ''سیر المصنفین''، منظرِ عام پر آیا جو نثر نگاروں کے ذکر پر مبنی تھا۔ اس بناء پر یہ بھی یک رخا تھا۔ شعراء کے تذکروں کی مانند اس میں بھی ادوار قائم کیے گئے تھے۔ مگر تاریخی تسلسل اس میں بھی ناپید تھا جس کے باعث اسے بھی تاریخ ادب کا وقیع نام نہیں دیا جاسکتا۔ سکسینہ کی تاریخ البتہ اس خامی سے مبراء ہے۔ کیوں کہ اس میں پہلی بار ادب کے دونوں پہلوؤں یعنی شاعری اور نثر کو برابر کی اہمیت دے کر ان کا اکٹھا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں خاصی حد تک تاریخی

تسلسل کو پیشِ نظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو تاریخ ادب کا لازمی خاصا ہے۔سکسینہ نے اس کتاب کی ترتیب میں انگریزی ادبی تاریخوں کا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص انگریزی ادب کے مشہور مؤرخ سینٹس بری (Saints Burry) نے جو انداز وترتیب اپنی تاریخ میں اختیار کیا ہے۔اسی انداز کو اختیار کرنے کا تعارف انہوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔کتاب کی تمہید میں سکسینہ لکھتے ہیں:

> ''اس بات کا شکایت کا موقع بھی ہوسکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فروگزاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سمند میں پروفیسر سینٹس بری کی کتاب ''مختصر تاریخِ علم وادب'' کی مثال پیش کرسکتا ہوں جس کی طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔''(1)

اس تاریخ کو تحریر کرتے ہوئے سکسینہ کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ایک تو اردو ادب کی تدریجی ترقی کا احوال بیان کیا جائے اور اس میں تحریکوں، رجحانات اور تاریخی حالات کی عکاسی کی جائے۔ جب کہ دوسرا مقصد یہ تھا کہ انگریزی دان طبقے کے لیے ایسی درسی کتاب (Text Book) تیار کی جائے جو انہیں اردو ادب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کر سکے۔ (۲۱) پہلے مقصد کے حوالے سے اگر کتاب کا جائزہ لیا جائے تو کتاب کے پہلے دو باب اس مقصد کو خاصی حد تک پورا کرتے نظر آتے ہیں۔

پہلے باب میں وہ اردو زبان کی تعارف، اس کی تاریخ، مختلف زبانوں کے اس پر اثرات اور اردو کے قدیم ناموں سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے باب میں دکن، دلی اور لکھنؤ کے شعراء کے فن اور ان کی خدمات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ جدید شعراء کا تعارف کراتے ہیں۔علاوہ ازیں نثر کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کی مختلف جزئیات سے روشناس کراتے ہوئے اس کا تدریجی احوال بیان کرتے ہیں البتہ وہ ہر دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس

منظر اور ادب پر ان کے اثرات کو واضح طور پر بیان نہیں کر سکے۔ اسی طرح ان کا بیان کردہ دوسرا مقصد بھی کتاب میں ہر جگہ واضح طور پر چھایا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اصل کتاب میں مصنف نے کہیں بھی مثالیں اور نمونے نہیں دیے۔ صرف اتنی ہی معلومات دی ہیں جتنی مذکورہ انگریزی دانوں کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔ زیادہ باریکیوں میں جانے اور گہری تحقیق کرنے کی ضرورت اسی مقصد کے تحت محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ مرزا عسکری نے اپنے ترجمے میں مثالیں اور نمونے فراہم کیے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ سکسینہ کی انگریزی کی اصل کتاب اور مرزا عسکری کے اردو ترجمے کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق

> اردو ترجمہ نول کشور پریس سے شائع ہوا اور اس میں عسکری نے نظم اور نثر کے حصوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔ یعنی اوّل حصہ نظم فہرست مضامین اور آخر میں اشاریہ ہے اور اس کے بعد حصہ نثر نئے صفحہ ایک شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا میں فہرست اور آخر میں اشاریہ ہے۔ انگریزی میں پوری کتاب ایک سلسلہ میں ہے۔ ابتداء میں جملہ ابواب کی فہرست اور آخر میں اشاریہ ہے۔'' (2)

اس کتاب کے دونوں حصوں میں کل انیس (۱۹) باب ہیں۔ پہلے تین ابواب میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کا بیان اور شاعری کی خصوصیات ہیں۔ ان کے بعد گیارہ ابواب شاعری اور پانچ نثر سے متعلق ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں لکھنوی، چکبست اور اقبالؔ کا تعارف ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند یہ ضمیمہ سکسینہ کے بجائے مرزا عسکری کا تحریر کردہ اضافہ ہے۔

اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی کئی چھوٹے اضافے کیے ہیں اور کئی جگہ اغلاط کی درستی کی ہے۔ مثلاً مرزا عسکری نے میر حسن کے تذکرے تذکرہ شعرائے اردو، سے مدد لے کر

غواصیؔ کے بارے میں ایک اقتباس کا اضافہ کیا ہے۔اسی طرح اردو ترجمے میں دکنی شعراء کے ضمن میں قطبیؔ، نوریؔ، جنیدیؔ، شاہیؔ اور مرزا کا اضافہ بھی مرزا عسکری کا ہے۔ گیان چند کے مطابق عادل شاہیوں کے بارے میں ص: ۲۴ کا پہلا پیرا عسکری کا اضافہ ہے۔اسی طرح عادل شاہ کے بارے میں خافی خاں کا اقتباس بھی اردو کا اضافہ ہے۔

سکسینہ نے اس کتاب کی تیاری میں بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے اور تذکروں سے بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے سب سے اہم ماخذ تین ہیں۔ اسپرنگر کی فہرست کتب خانہ شاہ اودھ،''آب حیات'' اور شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' ان کے علاوہ میر تقی میرؔ کے تذکرے''نکات الشعراء'' اور میر حسن کے تذکرے''تذکرہ شعرائے اردو'' سے بھی انہوں نے مدد لی ہے۔ مگر کہیں بھی اس بات کا اعتراف کیا اور نہ حوالے ہی دیے ہیں۔ البتہ ترجمے میں مرزا عسکری نے کہیں کہیں حوالے فراہم کیے ہیں۔ سکسینہ نے اس کمی کا خود بھی اعتراف کیا اور اسے دور کرنے کا ارادہ بھی کیا مگر اجل نے انہیں اس کے لیے وقت ہی نہیں دیا۔سکسینہ نے اس کتاب میں انتہائی مختصر انداز میں ہر دور کے تاریخی، سماجی اور سیاسی عوامل کا جائزہ لے کر زبان وادب پر ان کے اثرات دکھانے کوشش کی ہے۔ مثلاً پہلے باب''زبان اردو اور اس کی اصل'' میں وہ اردو زبان کا آغاز مسلمانوں کی آمد سے بتاتے ہیں۔ نیز یورپئین زبانوں اور عربی، فارسی زبانوں کے اردو پر کیا اثرات پڑے۔ اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ اسی طرح عہد اکبر اور دکنی دور کے زبان وادب پر ان ادوار کے سماج وسیاسی صورت حال کا اثر بھی دکھاتے ہیں۔ مگر یہ جائزہ بہت مختصر اور مثالوں کے بغیر ہے جس کے باعث کئی جگہوں پر تشنگی کا احساس رہتا ہے۔

یہ تاریخ ادب چوں کہ انگریزی دان طبقے کی معلومات کی خاطر لکھی گئی تھی۔ اسی لیے

سکسینہ جگہ جگہ اردو شعراء کا تقابل انگیز شاعروں سے کرتے ہیں اور اسی کی روشنی میں وہ اردو شعراء کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تقابل کا نقصان یہ ہوا کہ اردو ترجمے کی روانی اور اثر میں فرق آ گیا۔ کیوں کہ بیشتر اردو قارئین ان انگریز شعراء اور ان کی فنی خصوصیات سے واقف نہیں جتنے انگریز قارئین، سو وہ اق تقابل سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ سکسینہ کے نزدیک وہی شاعر بہتر ہے جس کے ہاں مغربی شراء جیسا رنگ نظر آئے۔ اس تقابل میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر شاعر اپنے معاشرے اور اپنے دور سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اسی معاشرے کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے۔ اس معاشرے کے زبان و محاورات اور رنگ و آہنگ کی عکاسی اس کی شاعری میں ہوتی ہے اور اس کے فن کی اصلی اور حقیقی خصوصیات اس کے سماجی ماحول کو سمجھنے سے ہی دریافت کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مرزا رفیع سوداؔ کے بارے میں سکسینہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔مرزا میں دانیال، والٹئیر اور سوئفٹ تینوں کا مزا ملتا ہے۔ ایڈیسن کی متانت ان میں مطلق نہیں ملتی۔'' (3)

اسی طرح آزادی کی اہمیت کے ذکر کے ضمن میں کہتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔آزاد کا مقابلہ انگریزی انشاء پردازیوں میں ڈیکوئنسی، لیمب اور اسیٹویسن سے جو صاحب طرز تھے، بخوبی ہوسکتا ہے۔'' (4)

اس قسم کی مثالوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سکسینہ مغربی شعراء اور ادباء سے بہت زیادہ واقف ہیں اور ان کے کلام کی فنی خصوصیات کو نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ ان سے کسی حد تک مرعوب بھی ہیں۔

سکسینہ نے تاریخ کا یہ سفر زمانی ترتیب سے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''زبانِ اردو اور اس کی اصل'' کے عنوان ہے۔ اس میں لفظ اردو کا مطلب، اردو کا

ہندی، فارسی، عربی اور دیگر یورپئین زبانوں سے تعلق، اردو کے قدیم نام، اردو کے رسم الخط جیسے مباحث ملتے ہیں۔ کتاب کا دوسرا باب ''ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ایک طرح سے طوری کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس میں نظم کا تقدم نثر پر اس کی وجوہ، امیر خسرو سب سے پہلا شاعر، عہدِ اکبر، جدید رنگ کے شعراء، اردو نثر، ناول نویسی اردو ڈراما وغیرہ کا مختصر مختصر تذکرہ کیا ہے۔ یہی مباحث زرا زیادہ تفصیل سے دیگر ابواب میں ملتے ہیں۔

تیسرا باب ''اردو شاعری کی عام خصوصیات سے متعلق ہے۔ اس میں وہ واضح کرتے ہیں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے اور محض نقالی ہے۔ وہ اردو شاعری کی اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ قطعہ، رباعی کی مختصر مختصر تعریف بیان کرتے ہیں اور مشاعرے کی تعریف کا بیان ملتا ہے۔

چوتھا باب ''قدیم شعرائے دکن'' سے متعلق اس میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی دور کے شعراء کا مختصر مختصر تعارف ہے۔ البتہ ان شعراء کے سنہ ولادت و سنہ وفات نہیں دیے گئے۔ صرف کتابوں وغیرہ کے نام دیے ہیں اور ان کے سنہ تصنیف کہیں دیے ہیں، کہیں نہیں دیے، ولی کا ذکر کافی تفصیل سے ہے۔ نیز ولی کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ دیے ہیں۔ اس باب میں دی گئی معلومات زیادہ ''اردوئے قدیم'' از شمن اللہ قادری اور ''دکن میں اردو'' از نصیر الدین ہاشمی اور تذکرہ شعرائے دکن، سے لی گئی ہیں۔ پانچواں باب اساتذہ دہلی، حصہ اول، طبقہ متقدمین، حاتم ''آبرو کا زمانہ'' کے عنوان ہے۔ اس باب میں دہلی کے قدیم شعرا کا تعارف دیا گیا ہے۔ سکسینہ نے شاہ مبارک آبرو کا سنہ ولادت نہیں دیا۔ صرف سنہ وفات ۱۷۵۰ء دیا ہے۔ مگر یہ سنہ درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب کی جلد دوم میں مختلف شواہد کی روشنی میں آبرو کا سنہ وفات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۷۳۳ء متعین کیا ہے۔ سکسینہ نے

خان آرزو کا سنہ ولادت ۱۶۸۹ء اور وفات ۱۷۵۶ء دیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے فٹ نوٹ میں اس سنہ کی تصحیح کرتے ہوئے ۱۰۹۹ھ/ ۸۸۔۱۶۸۷ء اور سنہ ولادت دیا ہے۔

سکسینہ شاہ حاتم کا سنہ وفات ۱۷۹۱ تحریر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اک مختصر بحث کے بعد رمضان ۱۱۹۷ھ/ جولائی ۱۷۸۳ء متعین کرتے ہیں۔

سکسینہ نہ تذکروں کی روایت پر یقین کرتے ہوئے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے واقعہ قتل کی جو روایت بیان کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس واقعہ کی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ’’مرزا شہادت کا واقعہ سیاسی نوعیت کا تھا انگریزوں کا سفارش پر جو حکم جا درجہ رکھتا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے نجف خان اصفہانی کو مسندِ وزارت ہر فائز کر دیا اور نجف خان نے جواب مجد الدولہ عبدالاحد خاں کو قید کر دیا۔ مرزا مظہر کی خانقاہ ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ بات نجف خاں کے لیے سیاسی طور پر خطرے کا باعث تھی۔ اس لیے اس نے مرزا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے امام باڑوں میں یہ افواہ پھیلوائی کہ انہوں نے محرم کے جلوس پر لعن طعن کی ہے جس سے شیعہ حضرات کے جذبات بھڑکنے لگے اور بالآخران پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ جنوری ۱۷۸۱ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ چنانچہ مرزا صاحب کی شہادت کی وجہ وہ نہیں تھی جس کا ذکر آب حیات اور دوسرے تذکروں میں کیا گیا بلکہ نجف خاں اصفہائی نے اپنے بااثر مخالف اور روہیلوں کے پیر و مرشد کو راستے سے ہٹانے کے لیے یہ قتل کرایا تھا۔

اس باب میں ناجی، تاباں، مضموں، یک رنگ وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے چھٹا باب ’’اساتذہ دہلی، حصہ دوم، طبقہ متوسطین میرا اور سودا کا زمانہ‘‘ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مرزا عسکری نے موقع بہ موقع اشعار شامل کیے ہیں۔ اس باب میں خواجہ میر دردؔ میر سوزؔ، سودا، میر حسنؔ، میر تقی میر کا تذکرہ ملتا ہے۔ میر درد اور میر سوز کے تذکرے نسبتاً مختصر ہیں۔ جب کہ سودا،

میر تقی میر اور میر حسن کے تذکرے کافی طویل ہیں۔ مرزا عسکری نے میر درد کے اشعار کا کوئی نمونہ نہیں دیا۔ میر سوز کے تین شعر بطور نمونہ دیے ہیں۔ مرزا سوداؔ کا حال البتہ خاصا طویل ہے جس میں سوداؔ کی فنی خصوصیات کے علاوہ سوداؔ کے فن کا دوسرے شعراء پر اثر بھی دکھایا ہے۔ میر حسن کے تذکرے میں مثنوی سحر البیان کا تقریباً ساڑھے گیارہ صفحوں کا طویل نمونہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کلام سے بھی نمونہ دیا ہے۔ میر تقی میر کے حالات البتہ دیگر تمام شعراء سے زیادہ تفصیل سے رہے ہیں اور ان کے کلام کا فنی تجزیہ بھی نسبتاً تفصیل سے دیا ہے۔ سکسینہ نے میر و سودا کے کلام کا فی تقابلی جائزہ لیا ہے اور دونوں کے کلام کو اپنی اپنی جگہ اہم سمجھتے ہیں۔

ساتواں باب بھی اساتذۂ دہلی سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان ہے ''اساتذۂ دہلی طبقۂ متاخرین، انشاء اور مصحفی کا زمانہ۔۔۔۔۔۔'' اس دور کے متعلق سکسینہ لکھتے ہیں کہ:

> اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ ماقبل کے شعراء گو اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں خرابی یہ ہوئی کہ گو شعراء کی قدردانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی عزت و آبرو کم ہوگئی شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں۔'' (5)

ااس باب میں انشاؔ، جرأت، مصحفیؔ، رنگینؔ، مرزا سلیمان شکوہ، اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر، قائم چاند پوری، منت، ممنون، حسرت، قدرت، بیدا، ہدایت، فراق، ضیا، بقا، حزیں، بیان اور راسخ کا ذکر کیا ہے۔ انشاء مصحفی، جرأت اور مصحفی کا ذکر نسبتاً تفصیل ہے۔ البتہ باقی دیگر شعراء کے کلام کی خصوصیات کا ذکر مختصر مختصر ہی کیا گیا ہے۔ اس باب کے ابتداء میں ریختی کا تعارف دیا اور چند ہزل گویانِ اردو کے نام بھی دیے ہیں۔

آٹھواں باب ''اساتذۂ لکھنؤ، ناسخ وآتش کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔۔اس میں لکھنؤ کے طرز شاعری اور طرزِ دہلی اور طرزِ لکھنؤ کے فرق کو تقابلی جائزے سے واضح کیا ہے۔اس باب میں ناسخ اور آتش کا ذکر خاصا تفصیلی ہے۔ البتہ دیگر شعراء برق، بحر، آباد، خواجہ وزیر، رشک، مہر، منیر، رند، خلیل، نسیم، قبا اور آغا حجو شرف کا تذکرہ ملتا ہے۔

نواں باب ''دربار لکھنؤ اور اس کے شعراء'' سے متعلق ہے۔اس باب میں آصف الدولہ آصف، نواب وزیر علی خاں وزیر، نواب سعادت علی خاں سعادت، غازی الدین حیدر، اختر واجد علی شاہ، اسیر، امانت، آفتاب الدولہ، خلق، ذکی، درخشاں، اور اختر کا تذکرہ ہے۔ مختصر مختصر تعارف کے ساتھ نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔

دسواں باب ''مرثیہ اور مرثیہ گو'' کے عنوان سے ہے۔اس میں ابتداء میں صنف مرثیہ کی تعارف ہے اور اس صنف کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور اس صنف کے مشہور شعراء کا تعارف دیا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے حالات اور فنی جائزے کے ساتھ ساتھ دونوں کا فنی تقابلی جائزہ بھی لیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''۔۔۔۔۔۔۔حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔حق یہ ہے کہ دبیر بھی مثل انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے۔''(6)

اس تبصرے سے سکسینہ کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

سکسینہ نے میر انیس کا شجرہ نسب بھی دیا ہے اس سلسلۂ خاندان کے چند مشہور مرثیہ گویوں کا تذکرہ دیا ہے۔ گیارہواں باب ''نظیر اکبرآبادی اور شاہ نیصر دہلوی'' سے متعلق ہے۔سکسینہ کی تاریخ کی ایک خصوصیت نظیر اکبرآبادی کا علیحدہ سے تعارف ہے۔اس سے بیشتر

تذکروں میں نظیر کو معمولی درجے کا متبذل شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ چوں کہ اس دور کی عام شعری روایت سے ہٹ کر اور عوام کی زبان میں شاعری کرنے کے باعث نظیر کا اپنا ایک الگ اور خاص رنگ تھا۔ اسی لیے اس دور اور بعد کے ادوار کے شعراء اور تذکرہ نگار انہیں ایک متبذل شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ سکسینہ نے سب سے پہلے نظیر کی فنی خوبیوں کو سمجھا اور ایک باقاعدہ اور اہم شاعر مان کر ان کی طرف توجہ کی۔ نیز ان کے لیے اپنی تاریخ ادب میں علیحدہ باب مختص کیا۔ سکسینہ نظیر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین لکھتا ہے۔۔۔۔۔اپنے متنوع مضامین، اپنی ناصحافہ، روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کو شعرائے اردو کی محفل میں ممتاز جگہ دی جائے۔'' (7)

سکسینہ کی تاریخ کے بعد نظیر اکبر آبادی کو اپنی تاریخوں میں شامل کرنا ایک باضابطہ روایت بن گیا۔ مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں پانچ صفحوں کا ایک مختصر باب (چھٹا باب) نظیر کے لیے مختص کیا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے بھی اپنے تاریخ میں نظیر کو جگہ دی اور بعد میں آنے والے ادبی مؤرخوں نے بھی نظیر کو باقاعدہ شاعر مان کر اپنی اپنی تاریخوں میں جگہ دی۔ اسی لیے ڈاکٹر گیان چندان الفاظ میں سکسینہ کی تعریف کرتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔تنقید میں سکسینہ کی اس دور بینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ترقی پسندوں سے بھی پہلے نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کی گرفت کی۔'' (8)

نظیر کے ساتھ شاہ نصیر دہلوی کا جوڑنا مناسب لگتا ہے۔ مگر شاہ نصیر کا ذکر دو متقدمین اور دو متوسطین کے بیچ کی کڑی ہونے کی وجہ سے علیحدہ سے کیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ

نظیر اور شاہ نصیر میں کسی بھی نوعیت کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔

بارھواں باب ''طبقہ متوسطین، ذوق و غالب کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔ ذوق و غالب کس طرح طبقہ متوسطین میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے وضاحت نہیں ہوتی جب کہ انشاء مصحفی وغیرہ کو سکسینہ طبقہ متاخرین میں شمار کرتے ہوئے ان کا بیان پہلے ہی چکے ہیں۔ زمانی ترتیب میں دیکھا جائے تو غالب، ذوق، مومن وغیرہ طبقہ متاخرین میں شمار ہوتے ہیں۔

اس باب میں مومن، غالب اور ذوق کے علاوہ شیفتہ، تسکین، نسیم دہلوی، ظہیر، انور، میر مہدی مجروح، سالک، زکی، رخشاں اور آزردہ کا ذکر ہے۔ ان میں غالب کے حالات، شاعری کے ادوار اور خصوصیات کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔

تیرھواں باب ''دربارِ رام پور و حیدر آباد، امیر و داغ کا ززانے'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں فرخ آیاد، عظیم آباد، مرشد آباد، ٹانڈہ، حیدر آباد، فیض آباد و لکھنؤ، ٹونک، سنگرول، بھوپال وغیرہ جیسے چھوٹے مراکز کا ذکر ہے۔ جنہوں نے دہلی اور لکھنؤ افڑنے کے بعد اردو شعراء کی سرپرستی کی اور اردو زبان و ادب کی ترقی میں برابر کا حصہ لیا۔ گویہ ذرخاصا مختصر اور سرسری سا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے اور بعد کی تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں کہیں بھی اس طرح ان مراکز اردو کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اس بات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی شاعری میں طرز دلی اور طرز لکھنؤ کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس امتزاج میں دلی کا رنگ و خصوصیات نسبتاً زیادہ اثر رکھتی ہیں۔

چودھواں (۱۴) باب ''اردو شاعری کا جدید رنگ، آزاد و حالی کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے آغاز میں سکسینہ جدید رنگ شاعری کی خصوصیات واضح کرتے ہیں۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انگریزی شاعری کی خصوصیات سے مرعوب ہیں اور ان کو پسند

کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اردو ادب میں موجود تین طبقوں کا ذکر کرتے ہیں۔ سکسینہ کے مطابق پہلا طبقہ قدامت پرست لوگوں کا ہے۔ جو طرز قدیم پر فریفتہ ہیں۔ زمانۂ جدید میں کوئی مفید خدمت سرانجام نہیں دیتے۔ البتہ ان کی کوششوں کے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔ دوسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے۔ جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات اپنے ماحول سے لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں اصلیت ہے۔ سکسینہ کے اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طبقہ کو پسند کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی، اکبر الہ آبادی اور نادر کاکوروی وغیرہ آتے ہیں۔ سکسینہ کے مطابق ان حضرات نے دونوں طرزوں یعنی قدیم و جدید کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کرلیا ہے اور انہیں پر آئندہ ترقی کی امیدوں کا دارومدار ہے۔

اس باب کے ساتھ ہی حصہ نظم ختم ہوجاتا ہے اور پندرھویں باب سے حصہ نثر شروع ہوتا ہے۔ نثر کے حصے یہ شمولیت ہی سکسینہ کی تاریخ کی خاص بات ہے۔ اس کے علاوہ اردو ناول اور اردو ڈرامہ کا بطور صنف تعارف ہے جو اس سے پہلے تذکروں یا نیم تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا تھا۔ اس باب کی پہلی سطر ''اردو نثر کی ابتدا واقعی فورٹ ولیم کالج سے ہوئی۔'' خاصی چونکا دینے والی ہے۔ کیوں کہ اس سطر سے تمام اردو کا قدیم نثری سرمایہ صفر ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے دکنی اردو کے نثری سرمائے کے علاوہ شمالی ہند میں بھی آسان اور رواں اسلوب کی بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ عالم ثانی کی داستان عجائب القصص، دکھنی زبان میں قدیم اردو نثر کی تصانیف کے ضمنی عنوان میں مؤلف ''دکن میں اردو'' میں لکھی کتابوں کا تعارف کراتے ہیں۔ یہاں وہ ''معراج العاشقین'' کو خواجہ گیسودراز کی تصنیف بتاتے ہیں جب کہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ یہ کتاب خواجہ گیسودراز کی نہیں ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل دونوں نے اس بات کو تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تخلیق نہیں ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اسباب سکسینہ نے مختصر بیان کیے ہیں اور گل کرسٹ کو اس کا منتظم اعلیٰ بتایا ہے۔ جب کہ بعد کی تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ گل کرسٹ شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر تھے۔ کالج کے منتظم اعلیٰ نہیں تھے۔

سکسینہ نے اس باب میں فورٹ کالج کے دیگر منشیوں کا مختصر تذکرہ دیا ہے اور ساتھ ہی اس دور میں جو قرآن پاک کے تراجم ہوئے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اٹھارہویں صدی میں جو اردو گرائمر اور لغات وغیرہ شائع ہوئیں اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

باب نمبر سولہ (۱۶) کا عنوان ہے۔ ''اردو کا متوسط اور جدید دور'' اس باب میں فقیر محمد گویاؔ، رجب علی بیگ سرور، غالب، سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء، مولانا آزاد، حالی، شبلی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی سید احمد دہلوی، مولوی عبدالماجد دریا آباد، پروفیسر رام چند، امام بخش صہبائی، غلام امام مشہد، غلام غوث بے خبر، سید حسین بلگرامی، مولوی عبدالحق، وحیدالدین سلیم وغیرہ کا تعارف دیا ہے۔ غالب، سرسید مولانا آزاد، حالی اور شبلی کا تعارف خاصا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

باب نمبر سترہ ''اردو ناول کی ابتداء، شرر اور سرشار کا زمانہ کے عنوان سے ہے۔ اردو ناول کا تعارف بطور صنف پہلی بار رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ میں کرایا ہے اور کئی ناول نگاروں کا تذکرہ اس باب میں شامل کیا ہے۔ اس باب کی ایک اہم خصوصیت اس دور کے ایک بڑے مطبع منشی نول کشور پریس کا تعارف ہے، جو انیسویں صدی کا اہم ترین پریس ہے اور جس کا شمار ایشیا کے چند بڑے مطابع میں ہوتا ہے۔

اس باب میں منشی سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ تر بھون ناتھ، ہجر نواسید محمد آزاد، سرشار، مرزا رسوا، راشد الخیری، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، پریم چند وغیرہ کا تعارف کرایا ہے۔

اس باب کا آغاز سکسینہ قصّوں سے کرتے ہیں۔ داستانوں کے ذکر کرتے کرتے منشی نول کشور پریس کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ پھر ''داستان امیر حمزہ'' اور ''بوستان خیال'' پر اظہار بیان کرتے ہوئے فسانہ عجائب کا تعارف کراتے ہیں اور اس کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرور نے فسانہ عجائب کی تصنیف سے لوگوں کے دلوں میں افسانہ کا شوق پیدا کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس داستان کے واقعات کو معمولی اور زبان کو پر تصنع اور پیچدار کہتے ہیں۔(۳۸) یوں خود سکسینہ کے بیان میں تضاد آ جاتا ہے۔ مولانا نذیر احمد کا ذکر بطور ناول نگار نہایت سرسری انداز میں کرتے ہیں اور نذیر احمد کو بحیثیت اردو کا پہلا ناول وگار جو اہمیت اور مقام دینا چاہیے تھا وہ یہاں انہیں نہیں ملتا۔

نذیر احمد کے مختصر تعارف کے بعد اودھ پنچ اور اس میں مضامین لکھنے والے لوگوں کا تعارف دیا ہے۔ مرزا مچھو بیگ عاشق، تربون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، یہ وہ لوگ ہیں جو کسی طرح بھی ناول نگار نہیں کہلا سکتے۔ ان کا تعارف ناول کے باب میں عجیب اور بھرتی کی چیز محسوس ہوتا ہے۔ اس شتر گربگی کے باعث اس باب میں کی خوبصورتی ختم ہوگئی ہے۔

اٹھارہواں (۱۸) باب ''اردو ڈرامہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ڈراما کے آغاز اور پس منظر کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ اردو ڈراما کا تعارف بھی اس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ ڈراما کے ضمن میں سکسینہ اس دور کی تھیٹر یکل کمپنیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اس باب کے آخر میں اردو ڈرامے کے بہترین مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔

انیسواں (۱۹) باب ''زبان اردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل

الرائے لوگوں کی قیمتی رائیں'' سے متعلق ہے۔ اس میں اردو زبان کی اہمیت وحیثیت اور اردو کا دیگر دیسی زبانوں کے مقابلے میں کیا مرتبہ ہے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ''ضمیمۂ تاریخ ادب اردو'' ہے یہ ضمیمہ مرزا عسکری کا اضافہ ہے اور اس میں نظرؔ لکھنوی، چکبست اور ڈاکٹر اقبالؔ کا تعارف دیا گیا ہے۔

اس تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنے دور میں اس کتاب پر کتنی زیادہ محنت کی ہے۔ اس کتاب میں بہت سی خوبیاں اور خصوصیات ہیں جو اس کی اہمیت کو قائم و دائم رکھتی ہیں۔ یہ ایک مکمل ادبی تاریخ ہے۔ کیوں کہ اس میں پہلی بار نظم اور نثر دونوں کے ساتھ ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور ادب کی اکائی کو برقرار رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ زمانی ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کی تدریجی ترقی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

ایک مستند اور اچھی تاریخ ادب کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں عہدِ گزشتہ کے ان رجحانات، تحریکوں اور اداروں وغیرہ کا بھی تعارف پیش کیا جائے جو ادب کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں سکسینہ کی تاریخ اس خصوصیت کی حامل نظر آتی ہے۔ وہ مختلف مقامات پر ادبی مقامات پر ادنی رجحانات، تحریکوں اور اداروں کا تعارف کراتے ہیں جن سے بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً باب نمبر (۱۳) میں وہ اردو ادب کے ایسے مراکز کا ذکر کرتے ہیں۔ جو دہلی اور لکھنؤ سے چھوٹے ہونے کے باوجود اردو کی خدمت میں مصروف تھے۔ فرخ آباد، فیض آباد، ٹونک، ٹانڈہ، منگرول، بھوپال اور رام پور کا مختصر تعارف دیتے ہوئے سکسینہ نے انہیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، دارالترجمہ، مطبع نول کشور وغیرہ جیسے ادارے جو ادب کی ترقی میں بلاواسطہ یا بالواسطہ مددگار رہے تھے ان کے متعلق بھی بہت سی معلومات سکسینہ کی تاریخ میں مل جاتی ہیں۔

سکسینہ کی تاریخ کے اسلوب میں سادگی اور متانت کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ تعریف کے ضمن میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی ان کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ سادہ اور بے تکلف انداز میں اپنی رائے یا تبصرہ پیش کر دیتے ہیں جس میں ادبیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ سکسینہ شعراء و ادباء کے حالات و واقعات کے بیان میں بہت زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیتے اور کسی واقعے یا سنہ کے متعلق زیادہ تحقیق و جستجو نہیں کرتے۔ انہوں نے جو تاریخی حقائق اور معلومات پیش کی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نئی تحقیقات کے سامنے آجانے سے، بہت کچھ غلط ثابت ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اس بارے میں کہتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔ یہ خیال رہے کہ رام بابو سکسینہ کی کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تسوید دو تین برسوں میں ہوئی ہوگی۔ اس وقت تک جدید تحقیق اور تنقید دونوں کا آغاز ہی ہوا تھا۔ ان کو جو تحقیقی وراثت ملی تھی۔ اسے نظر میں رکھا جائے تو ان کے تسامحات قابلِ درگزر رہیں۔۔۔۔۔' (9)

اس لحاظ سے سکسینہ کی تاریخ ادب اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود تواریخ ادب کی فہرست میں اوّلیت کا مقام رکھتی ہے کیوں کہ اس سے باقاعدہ طور پر ادبی تواریخ کی باضابطہ روایت کا آغاز ہوتا ہے اور آج بھی ابتدائی معلومات کے لیے اس تاریخ کی مدد لینا ناگزیر ہے۔

تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی

احسن مارہروی کی ''تاریخ نثر اردو نمونہ منشورات'' 1930ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابقہ ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کہتے ہیں:

> ''اردو زبان کو لسانی و تہذیبی پس منظر میں سمجھنے کے لیے یہ کتاب سودمند ہوگی اور اردو

نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے محققین کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے''۔(10)

اس کتاب کے مرتب رحیل صدیقی دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک تاریخ نثر اردو کے حوالے سے جتنی اہم کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، ان کے مصنفین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے''۔(11)

یہ کتاب دراصل دو جلدوں میں تھیں۔لیکن اس کی دوسری جلد نایاب ہے۔ یہاں ان کی پہلی جلد کا تبصرہ مقصود ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ خاصہ طویل ہے۔ اس میں اردو بان کی ترقی وترویج پر اہم معلومات شامل ہیں۔مختلف عنوانات کے تحت اردو زبان کی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔اس مقدمے میں عام نظریے کے ساتھ ساتھ راقم اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ان کے مطابق نظم سے پہلے نثر کا آغاز ہوا ہے۔اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے راقم لکھتے ہیں:

''ہرزبان کی ابتدا معمولی الفاظ، آسان کاموں اور سہل باتوں سے ہوا کرتی ہے۔''

اردو زبان کے آغاز سے متعلق احسن مارہروی کا خیال یہ ہے کہ

''ہندوستان کے قدیم عہد میں جبکہ سنسکرت زندہ زبان مانی جاتی تھی اور مخصوص اہل علم اور مہاتماؤں کے استعمال میں رہا کرتی تھی، اس وقت صوبہ جات ہند میں بھاشا کی مختلف شاخیں متعدد ناموں سے مروج ومشہور تھیں اور ہر وقت کی بات چیت اور بازار ہاٹ کا کام وکاج اسی عام زبان سے پورا کیا جاتا تھا۔رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں کے زمانے میں جن کی مادری زبان فارسی یا ترکی تھی، اور دفتر، خط وکتابت نیز تصنیف وتالیف میں عموماً فارسی ہی کا دور دورا تھا، بازار اور دوسری باتوں کے لیے بھاشا سے ملی جلی ایک ایسی نئی زبان بولی جانے لگی جس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ الفاظ شامل رہتے تھے۔یہی وہ امیختہ زبان تھی جس کو ابتداء شعرا ریختہ اور عام ادبا اردو کہا کرتے تھے۔''13

یہ کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تصنیف و تالیف سے متعلق ہے جو چھ ادوار پر مبنی ہے۔ یہ حصہ 1398ء سے لے کر 1930ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔

دوسرا حصہ دفاتر سلطنت کے نمونوں سے متعلق ہے اور دو ادوار پر مبنی یہ حصہ 1841ء سے شروع ہو کر 1930ء پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا حصہ 1847ء سے 1930ء تک دو ادوار پر مبنی ہے۔ اخبارات کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح قانونی تراجم پر مبنی چوتھا حصہ 1851ء سے لے کر 1930ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد تقریظ وتنقید کا پانچواں حصہ 1842ء سے 1930ء تک پھیلا ہوا ہے اور دو ادوار پر مشتمل ہے۔

چھٹے اور آخری حصے میں 1852ء سے لے کر 1930ء تک کے خطوط کے نمونے ہیں۔ ان چھ حصوں میں مولانا احسن نے ہر ممکن حد تک نثری نمونے حاصل کر کے پیش کیے ہیں اور ان کی مدد سے اردو زبان کی بتدریج ترقی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مقصد کے بارے میں مصنف کا خیال یہ ہے کہ:

> ''تاریخ نثر اردو نمونہ منشورات حصہ اول میں تاریخی حلات مفید کے سوا اردو نثر کے مذہبی، اخلاقی، طبی، سیاسی، قانونی، دفتری، مکتوبی، اخباری، تقریری، اشتہاری غرض وہ تمام نمونے جو ایک علمی اور زندہ زبان کو وقیع بنا سکتے ہیں۔ 1398ء سے لے کر عصر حاضر تک اصلی تصنیفات و تحریرات سے نقل کئے گئے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ایک معمولی طالب علم بھی اپنی مادری زبان کی تدریجی ترقی کو بخوبی اور بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔'' 14

اس تحریر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ کتاب ادب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ صرف زبان کی تاریخ ہے جس میں صرف نثر کے نمونے دیے گئے ہیں اور مصنفین کے حالات و

کوائف اور دیگر معلومات قطعاً نہیں ملتیں۔ نثری نمونے زمانی ترتیب سے دئے گئے ہیں۔ ہر نمونے کی ابتداء میں نمبر شمار، کتاب کا نام، مصنف کا نام، اور سنہ تصنیف ایک چارٹ کی صورت میں دیے گئے ہیں۔ اکثر نمونوں کے بعد آخر میں تبصرہ و کیفیت ہے جس میں صاحب کتاب کے فن اور کتاب کی فنی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی بلکہ کتاب کی املا یا اس سے متعلق کچھ اور معلومات دی گئی ہیں۔

احسن مارہروی نے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس کے عرصے کو اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس زمانے کو کم و بیش ایک صدی کے حساب سے چھ ادوار میں تقسیم کیا گیاہ۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ ایک مکمل تاریخ نہیں ہے۔ یہ کتاب صرف زبان کی تاریخ ہے کیونکہ اس میں صرف ادبی نثر کو پیش نظر نہیں رکھا گیا لکہ اخبارات، قانونی تراجم، خطوط اور دفاتر سلطنت جیسے مختلف شعبہ ہائے نثر کے نمونوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان نمونوں پر غور کرنے سے پانچ ساڑھے پانچ سو برسوں میں اردو زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مولانا احسن مارہروی نے اس کتاب میں اصل مآخذ سے براہ راست نمونے دیے ہیں۔ مگر ان نمونوں کی فنی و علمی حیثیت پر تنقید نہیں کی۔ بلکہ خود قاری پر یہ ذمی داری ڈال دی ہے کہ وہ ان ادوار کے بغور مطالعے سے زبان کی تدریجی ترقی کو سمجھے اور ہر دور میں زبان کی کیفیت کو پہچانے۔ مارہروی کی اس کوشش کی ایک خامی یہ ہے کہ محض نثری نمونوں کے اندراج سے متعلقہ ادوار کی سماجی و سیاسی صورت حال اور ادب پر ان کے اثرات کا درست اندازہ نہیں ہو پاتا۔ علاوہ ازیں ان نمونوں یا ان سے متعلق کتابوں کے ادبی و فنی نقطہ نظر کا بھی تعین نہیں ہو پاتا۔ اس طرح اس تاریخ سے زبان کی تدریجی ترقی کا تو اندازہ ہو جاتا ہے۔ مگر ادب کی ترقی و کیفیت کا پتا نہیں چلتا۔ مارہروی نے اس کتاب میں صرف انہی لوگوں کو بطور نمائندہ

پیش کیا ہے جو ان کے خیال میں صاحب طرز ہیں مگر ان لوگوں کی نگارشات نے زبان و ادب پر کیا اثر ڈالا۔ اس بات کی کہیں وضاحت نہیں کی۔

مارہروی نے اس کتاب کو چھ مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''عام تصنیف و تالیف'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں معراج العاشقین سے لے کر ''گل رعنا'' پر محیط ہے۔ اس حصے کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کے بعد اس دور کی زبان کی کیفیات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس حصہ کا پہلا دور 1398ء سے 1494ء تک کا دور ہے۔ اس دور میں صرف ایک نمونہ نثر کا دیا ہے۔ یہ نمونہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کتاب معراج العاشقی سے دیا گیا ہے۔ اور اس کا سنہ تصنیف 1398ء دیا ہے۔ تبصرہ کیفیت میں بتاتے ہیں کہ اس دور کی کوئی اور تصنیف دریافت نہیں ہوئی اور اس کتاب کی حقیقت کے بارے میں بھی واضح کرتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کے مقدمے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کسی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے۔ تبصرہ کے بعد قدیم دکنی کے چند نامانوس الفاظ کی فہرست دی ہے۔

دوسرا دور 1495ء تا 1592ء تک کا احاطہ کیا ہے۔ اس دور میں دو نمونے دئے ہیں۔ نثر کا ایک نمونہ شرح مرغوب القلوب از حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق سے دیا گیا ہے۔ اور دوسرا کلمۃ الحقائق از شاہ برہان الدین جانم سے دیا گیا ہے۔ اس دور کے تبصرے میں بھی وہ ان کتابوں کے ادبی معیار اور اردو ادب روایت میں ان کے مقام کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ البتہ زبان کے متعلق صرف یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

> ''مبصرین زبان کو اس دور کا لب و لہجہ پہلے دور سے متغائر نظر نہ آئے گا بلکہ جا بجا نوعیت مضامین کے لحاظ سے پہلے دور کے مقابل میں بعض اسالیب بیان اور الفاظ نئے معلوم ہوں گے۔'' 15

تیسرا دور 1592ء سے 1689ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں چار کتابوں سے نمونے دئے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا نمونہ شاہ امین الدین اعلیٰ کی کتاب ''گنج مخفی در مبحث شاہد ومشہود سے لیا گیا ہے۔ جو 1601ء کی تصنیف ہے۔ دوسرا نمونہ'' شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید از حضرت شاہ میران صاحب یا شاہ میراں جی حسن خدا نما سے لیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1603ء بتایا گیا ہے۔ تیسرا نمونہ ''احکام الصلاۃ، موافق فقہ حنفی'' از مولانا عبداللہ معاصر قطب شاہ سے لیا گیا ہے۔ یہ سنہ 1622ء میں لکھی گئی۔ چوتھا نمونہ ملا وجہی کی ''سب رس'' سے لیا گیا ہے ل جس کا سنہ تصنیف 1630ء بتایا گیا ہے۔ اس خاصا طویل اقتباس بطور نمونہ دیا ہے۔ اس دور پہ تبصرہ کرتے ہوئے مارہروی لکھتے ہیں:

''مقررہ شمار کے لحاظ سے یہ دور تین صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان زمانوں کی زبانوں کے مابین کوئی بین اور مابہ الامتیاز فرق نظر نہیں آتا۔ بجز اس کے کہ ایک دور کے مقابل میں دوسرے دور میں بعض الفاظ کی کمی بیشی ہوگئی ہو۔''16

اس تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احسن مارہروی نے ان کتابوں کو بغور پڑھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ زبان کے لہجے کا فرق عماماً پہلی نظر میں سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اس حصہ عام تصنیف وتالیف کا چوتھا دور 1689ء سے 1782ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں بھی چار کتابوں کے نمونے دیے گئے ہیں اور ہر نمونہ کے بعد اس پر تبصرہ دیا گیا ہے۔ پہلا نمونہ 1715ء کی ایک کتاب صرف ونحو ہندوستانی سے لیا گیا ہے جو ایک یورپی مستشرق جان جوشوا کیٹلر کی تصنیف ہے۔ دوسرا نمونہ محمد قادری کی ''طوطی نامہ'' سے لیا گیا ہے جس کا سنہ تصنیف 1729ء دیا گیا ہے۔

تیسرا نمونہ فضلی کی کتاب کا دیباچہ ہے۔ اس پر مارہروی اپنا اظہار خیال یوں کرتا ہے

''چوں کہ کربل کتھا اور اس مترجم کا حال تشنہ تحقیق ہے۔ اس لیے مسٹر فیلن کے تذکر

ے سے اس کتاب کا پورا دیباچہ نقل کر دیا گیا ہے کہ کمیاب چیز کا جتنا حصہ شائع ہو جائے تاریخی حیثیت سے مفید ہے۔''17

اس تبصرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ احسن مارہروی تاریخی اور قدیم چیزوں کی اصل اہمیت کو سمجھتے اور پہچانتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان سے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

چوتھا نمونہ مرزا سودا کے دیباچہ ''دیوان مرثیہ'' سے لیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1766ء بتایا گیا ہے۔ مارہروی کے مابق سودا کا یہ دیباچہ ان کے مطبوعہ کلیات میں دیوان مراثی کے ساتھ موجود ہے جس کو انھوں نے اپنی طبعی افتاد کے مطابق کسی حریف فن کے لیے لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سودا نے اس مثنوی پر اردو نثر میں ایک دیباچہ لکھا جس میں مرثیے اور شاعری کے تعلق سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔''18

پانچواں دور 1787ء سے 1883ء تک کا ذکر ملتا ہے۔ اس دور میں 68 نمونے دیے ہیں۔ اس میں مختلف اقسام کے نمونہ ہائے نثر جمع کیے گئے ہیں۔ اس میں احسن مارہروی نے ادبی نثر کے نمونے بھی شامل کیے ہیں اور قرآن کے تراجم سے بھی نمونے شامل کیے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ قانینی تراجم کے نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس پوری صدی کی نثر کی خصوصیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ابتدائے دور سے پون صدی تک اردو زبان کی ترکیب انشا اپنے دور ماقبل سے قریب تر نظر آتی ہے اور پرانے ادق گنجلک ڈھیلی بندشوں الجھی ترکیبوں والے اسالیب اس میں ملتے ہیں لیکن اس کے بعد تحریر میں سلاست روانی آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک نئی اور اہم معلومات بھی اس دور کے نثری نمونوں میں ملتی ہے۔ ایک کتاب ''مطلوع القمرین فی احکام العیدین'' از سید احمد بن سید درویش سے ایک نمونہ دیا ہے۔ اس کتاب کا سنہ

تصنیف 1848ء ہے اور یہ کتاب کرناٹک یا جنوبی ہند کے روزمرہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مارہروی کہتے ہیں کہ:

''اس کتاب سے اپنی نوعیت تاریخ کے لحاظ سے ایک نئی معلومات ملتی ہے۔ یعنی املائے اردو کی بعض خصوصیات کے متعلق عموماً یہ مشہور ہے کہ پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات مسٹر ہالرائیڈ کی تحریک سے اس عدیا کے اہل قلم نے ہائے معروف ومجہول اور دوچشمی یا کھلی ہوئی ہائے ہوز کی کتابت کا خاص التزام کیا تھا اور گویا موجودہ املائے اردو کی اصلاح وترمیم اسی وقت سے شروع ہوئی ہے لیکن زیرنمونہ کتاب کو دیکھ کر یہ راز کھلتا ہے کہ اب سے سوسال پہلے جنوبی ہند میں اس جدت املا کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی۔''[19]

چھٹا دور 1883ء سے 1930ء تک کے زمانی عرصے پر محیط ہے۔ اس حصے میں مختلف نوعیتوں کے چھیاسی نمونے دیے گیے ہیں اور آخر میں بیس صفحوں پر اس پورے دور کا لسانی جائزہ لیا ہے اور مشہور صاحب طرز اہل قلم کے اسلوب کا مختصر تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تجزیہ سے مارہروی کی ناقدانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی بعض باتیں اور تجزیے اس نوعیت کے ہیں کہ آج بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مثلاً زبان کے بارے میں کہتے ہیں:

''آج ہم جس زبان کو نہیں سمجھ سکتے یا نہیں بولتے اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ زبان کس کام کی اصولاً اپنی نادانی ونافہمی کا ثبوت دینا ہے۔''[20]

اس تبصرے میں دور اوّل سے دور ششم تک کا مختصر مگر جامع لسانی تجزیہ ان کی مؤرخانہ بصیرت کا احساس دلاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اپنے ابتدائی عہد کے سبب نیز دوسری حکومتی یا تصنیفی زبان کے زیداہ مروج ہونے کی وجہ سے اس نے چوتھے دور تک وہ حیثیت پیدا نہیں کی جو ایک علمی زبان کے لیے مخصوص ہوسکتی ہے۔ اشد ضرورت اور تبلیغِ مذہب کی خاطر قدیم عہدوں میں

جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ بالا کثر ایک محدود و مخصوص حلقے اور دائرے کے لیے تھیں نہ عام ترویج کے واسطے۔۔فی الحقیقت اردو زبان کو جتنی نمایاں ترقیاں دور پنجم و ششم میں حاصل ہوئی ہیں۔وہی علمی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔''21

اس تبصرے سے مارہروی کے بعض معیارات کا پتہ چلتا ہے۔مثلاً صاحب طرز قلم نگار میں کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''اہل قلم کے صاحب طرز ہونے کا جو معیار راقم نے اپنے ذہن ناقص میں قائم کیا ہے۔اس کی مختصر شرح یہ ہے کہ وہ انداز بیان جسے اپنے مقدم و معاصر، نیز متعاقب اہل قلم کی طرز ادا کے مقابل ایسی خصوصیات حاصل ہوں جن کو دوسرے نہیں لکھتے اور اس کا امتیاز دیگر ہم معنی مضامین میں خلط ملط کر دینے کے بعد بھی ایک مشاق مبصر کو بیک نظر ہو جائے،اسلوب خاص کہے جانے کا مستحق ہے۔'' 22

اس کے ساتھ ساتھ مارہروی بعض اہل قلم کے اسلوب پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو آج بھی صحیح لگتی ہیں۔

''فی زمانہ جس اردو کو علمی زبان کہہ سکتے ہیں وہ انھیں ارکانِ خمسہ کی قوت اجتہادی اور تصرفات افادی کا فیض عام ہے۔'' 23

اسی طرح اس تبصرے میں ان کی یہ رائے کہ زندہ رہنے والی زبان کے حق میں ترمیمیں اور اضافے مفید و ضروری ہیں۔بشرطیکہ اصول و قواعد کے تحت ان کے رد و قبول کے لیے مرکزی حیثیت سے کوئی معیار قرار دیا جائے،آج بھی اہمیت کی حامل ہے اور اہل فکر کے لیے سوچ اور فکر کا مواد فراہم کرتی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ ''دفاتر سلطنت'' کے عنوان سے ہے۔اس عنوان کے تحت 1841ء سے لے کر 1930ء تک کے نمونے دوراد وار میں جمع کئے گئے ہیں۔پہلا دور 1841ء سے 1859ء تک کے زمانی دور پر محیط ہے۔دور اول کے تبصرے میں ایک پتے کی بات لکھتے ہیں کہ

دفتری زبان علمی زبانوں کی طرح قابل سند یا ادبی زبان نہیں ہوسکتی ، وہاں ملکی معاملات پیش اور فیصل ہوتے ہیں جن کے لیے عام فہم روزمرہ ہونا چاہیے نہ کہ انشا پردازانہ تکلفات ۔اس حصے کا دوسرا دور 1866ء لے کر 1930ء تک پھیلا ہوا ہے۔اس دور کے چودہ نمونے دیے گئے ہیں۔

اس حصے کے آخر میں مارہروی نے دفتری زبان سے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں،۔ان کے مطابق 1835ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دفتری زبان فارسی کو بنایا اور دس بارہ برسوں کے بعد اردو نویسی روع کی مگر اس قدر گنجلک اور پیچیدہ کہ قدیم دکنی معلوم ہوتی تھی ۔البتہ 1857ء کے بعد عام فہم اردو کا آغاز ہوا۔احسن مارہروی کے مطابق :

''جزوی واصطلاحی فرق کے سوا دفاتر کی زبان میں مجموعی حیثیت سے کوئی اصولی یا ادبی امتیاز نہیں پایا جاتا۔حکام،عملہ،محرر اور وکیل جس قابلیت وواقفیت کے حامل ہوتے ہیں اسی حیثیت کی زبان استعمال کرتے ہیں۔''24

''تاریخ نثر اردو'' کا تیسرا حصہ اخبارات کے متعلق ہے جس میں چار ادوار ترتیب دیے گئے ہیں اور آخر میں تبصرہ وکیفیت میں اخبارات کی زبان اور اسالیب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ پہلا دور 1847ء سے 1856ء تک محدود ہے۔اس حسہ میں سات نمونے دیے گئے ہیں۔دوسرا دور 1857ء سے 1882ء تک کے زمانی عرصے پر محیط ہے۔اس دور میں پانچ نمونے دیے ہیں۔تیسرا دور 1884ء سے 1900ء تک پھیلا ہوا ہے۔اس میں چار اخبارات کے نمونے دیے گئے ہیں۔چوتھا دور 1901ء سے 1930ء تک ہے۔اس میں اکیس نمونہ جات فراہم کیے گئے ہیں۔آخر میں اس حصے پر مفصل تبصرہ وکیفیت ہے جس کے بعد پہلے دور سے لے کر چوتھے دور تک کے اخبارات کی فہرست دی گئی ہے۔اس حصہ کے اختتام پر احسن مارہروی نے بڑا جامع تبصرہ مختلف ادوار کے اخبارات کے مذاق سخن پر دیا ہے۔ پہلے دور کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اکثر خبروں کا اندراج کہانی اور افسانوں کے رنگ میں ہوتا تھا اور زبان مسجع ومقفیٰ ہوتی

تھی۔مگر پنجاب کے اخبار اس زمانے میں بھی سیاسی مذاق اور عام رجحان کے تابع نظر آتے ہیں۔دوسرے دور میں اخباروں کی زبان بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور مضامین کی نوعیت بھی علمی اور تاریخی ہے۔احسن مارہروی کے مطابق:

''اودھ اخبار اور سب سے زیادہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی کوششیں اپنے عہد کے تمام اخباروں کی تبدیلی مذاق کا باعث ہیں'' 25

تیسرے اور چوتھے دور کے متعلق وہ رقم طراز ہیں

''اس نصف صدی میں دونوں عہدوں کی زبانوں میں کوئی خاص امتیاز و فرق نہیں۔ البتہ خیالات کا تغیر و تبدل اور خدمات کا جزر مدّ ہر دور کی طرز نگارش کو جدا جدا دکھاتا ہے۔'' 26

اس کتاب کا چوتھا حصہ قانونی تراجم کے لیے مختص ہے۔یہ حصہ بھی دو ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلا دور 1851ء سے 1900ء تک محدود ہے۔اس میں بارہ نمونے دیے گئے ہیں۔جو دیوانی عدالت کے دستور العمل،تعزیرات ہند،اردو گزٹ مغربی و شمالی مرتبہ عمال حکومت،رسالہ مباحث بندوبست وز میں داری،مجموعہ ضابطہ دیوانی وغیرہ سے لیے گئے ہیں۔

قانونی تراجم کا دوسرا دور 1900ء سے 1930ء پر مبنی ہے۔اس میں صرف دو نمونے ہیں جو قانون مال گزاری 1901ء اور ایکٹ انکم ٹیکس مرتبہ لیجس لیٹو کونسل سے متعلق ہے۔

اس حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ

''قانونی تراجم اگرچہ آسان روزمرہ میں کئے جاتے ہیں مگر ان کی عبارتیں خاص خاص اصطلاحوں کی وجہ سے ایسی پیچیدہ اور مختصر ہوتی ہیں کہ جب تک قانونی تعلیم کے ساتھ مشق و مہارت نہ بڑھائی جائے عام اہل ادب اور ارباب تصنیف ان کے مطالب نہیں سمجھ سکتے۔'' 27

تقریظ و تنقید کے عنوان سے اس کتاب کا پانچواں حصہ ہے۔ اس حصے میں مولانا احسن بدلتے حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پرانی طرز تحریر جس کو تقریظ کہا جاتا ہے فی زمانہ یک قلم متروک ہے۔ اس کا ابتدائی نمونہ امام بخش صہبائی اور مرزا غالب کی عبارتوں میں موجود ہے۔ مغربی انشاء پردازی نے اہل مشرق کو انگریزی پڑھنے کے بعد اس طرف متوجہ کیا کہ جس تصنیف کے متعلق کوئی رائے لکھی جائے اس میں پوری طرح ہر پہلو پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ اب یہ استوار عام ہو گیا ہے۔'' 28

اس حصہ کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور 1842ء سے 1882ء تک ہے۔ اس دور میں صرف چار نمونے دیے گیے ہیں جن میں سے ایک مولانا صہبائی کے دیباچہ سے لیا گیا ہے اور باقی تین نمونے مرزا غالب کی تقریظ سے لئے گئے ہیں۔ اس حصے کے نمونوں میں انداز تحریر پرانی محمد شاہی روشوں جیسا ہے کہ عبارت مسجع و مقفی لکھی جاتی ہے اور زیادہ تر کتاب اور صاحب کتاب کی تعریف ہی بیان کی جاتی ہے۔ اس دور کے تبصرے میں مارہروی کہتے ہیں کہ نئے انداز کی تنقید دوسرے دور میں شروع ہوئی۔ دوسرا دور 1880ء سے 1930ء تک ہے۔ اس میں نمونے دیے ہیں جن میں دو دیباچے، دو تقریظیں اور چار تنقید کے نمونے ہیں۔

آخری اور چھٹے حصے میں خطوط کے نمونے ہیں۔ اردو میں خطوط نویسی کی باقاعدہ ابتداء انیسویں صدی کے نصف آخر میں مرزا غالب کے خطوط سے ہوتی ہے۔ بقول مارہروی

''رجب علی سرور اور غلام امام شہید وغیرہ کی تصانیف میں بھی دو ایک اردو خط نظر آتے ہیں مگر ان کو اطفال داستاں کے لیے فرضی اور تمثیلی خطوط کہا جا سکتا ہے۔ نہ واقعی اور اصلی۔'' 29

اس لحاظ سے مرزا غالب کے خطوط، خطوط نویسی کی روایت کا باقاعدہ آغاز ہیں۔

اس دور میں عربی فارسی کی ترکیبیں اور قدیم اسالیب بیان ملتے ہیں اور بیسویں صدی کے شروع سے ان تکلفات کو ترک کر دیا گیا۔ یہ حصہ بھی دو ادوار میں تقسیم ہے۔ پہلا دور 1852ء سے 1900ء تک محیط ہے۔ اس دور میں بائیس خطوط کے نمونے دیے گئے ہیں۔ دوسرا دور 1901ء سے 1930ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں 44 خطوط کے نمونے دئے ہیں۔ ان خطوط میں مختلف مشاہیر و ادبا کا اسلوب نظر آتا ہے۔ وہاں زبان کی تدریجی تبدیلیوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس طرح ان چھ حصوں یا نمونوں میں زبان کی تدریجی ترقی کا جائزہ مختلف اصناف کے تحت لیا گیا ہے۔ چونکہ صرف نمونوں کے ذریعے زبان کی ترقی کا عمل دکھایا گیا ہے اس لئے زبان پر گزرتے وقت اور حالات کا سیاسی و سماجی عوامل کے تحت کیا اثر پڑا۔ اس کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ اپنے تبصروں میں احسن اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جس کے نتیجے میں ادھورا پن اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال مارہروی کی یہ کتاب بہت سی خامیوں کے باوجود اس لحاظ سے آج بھی کام کی چیز معلوم ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے اردو زبان کی تدریجی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ اس کو عمومی ادبی تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔

A HISTORY OF URDU LITERATURE

GRAHAM BAILEY.T

سکسینہ کی تاریخ کی طرح اردو ادب کی دوسری باقاعدہ تاریخ بھی انگریزی زبان میں تھی۔ جسے گراہم بیلی نے تحریر کیا تھا۔ یہ 1932ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کا مقصد بھی انگریزوں کو اردو ادب سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ یہ تاریخ انتہائی مختصر ہے۔ اس میں صرف آٹھ باب ہے۔ جن میں اردو کی پوری کہانی کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شعرا اور ادبا کے حالات مختصر انداز میں یان کیے گئے ہیں۔ اور چند ایک کے نمونہ ہائے کلام بھی دیے گئے ہیں۔

تمہید میں بیلی کہتا ہے کہ اردو شعراء سے متعلق ابتدائی معلومات ہمیں تذکروں سے ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی ایسی مشکلات کا ذکر کرتا ہے جو اردو ادب کے مطالعے کے دوران مین انگریز قائین کو پیش آتی ہیں۔ مثلاً ابتدائی اردو ادب زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں ملتا ہے اور ابھی تک ان مخطوطات کے طبع ہونے کے بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ان مخطوطات تک بہ آسانی رسائی بھی ممکن نہیں۔ بیلی تمہید میں اردو کی اہم اصنافِ شاعری کا تعارف بھی کراتا ہے۔ تاکہ انگریزی قارئین ان سے واقف ہو جائیں۔ علاوہ ازیں وہ نامور شعراء کی ایک فہرست شعری اصناف کے حوالے سے تیار کرتا ہے جس میں وہ شاعروں کو اپنی پسند کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب اردو زبان کی مختصر تاریخ پر مبنی ہے۔ اس میں بیلی نے یہ سمجھانے کے لیے کہ اردو زبان کس طرح بنی انگریزی زبان کی تشکیل کو بطور مماثل پیش کیا ہے۔ کیونکہ انگریز قارئین اپنی زبان کی مثال ہی سے اس بات کو درست طریقے سے سمجھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بیلی نے ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی بھی کی ہے۔

بیلی کے مطابق اردو کا آغاز دہلی میں نہیں لاہور میں ہوا اور قدیم پنجابی اس کا ماخذ تھی برج بھاشا یا کھڑی بولی نہیں اور جیسے ہی غزنوی افواج لاہور میں داخل ہوئیں اردو کا آغاز ہوا۔ اس طرح بیلی کے نزدیک اردو کے ارتقا کے دو دور بنے۔ایک دور وہ جب 1027ء کے آس پاس لاہوری اردو کا آغاز ہوا جو قدیم پنجابی اور فارسی کی آموزش سے بنی اور دوسرا دور 1193ء میں شروع ہوا جس میں لاہوری دور پر پرانی کھڑی بولی کی تہہ چڑھنے سے دہلوی اردو کا آغاز ہوا۔ بیلی نے پنجابی اور اردو کے مزاج کے بنیادی اختلافات کی طرف توجہ نہیں کی۔ دور سرے بیلی حافظ محمود شیرانی سے بھی متاثر ہوئے تھے۔

دوسرا باب دکنی اردو کے تعارف نیز آغاز وارتقاء سے متعلق ہے۔ یہ باب تقریباً 380 سال کا احاطہ کرتا ہے۔اور اس میں بے شمار اہل قلم کا تعارف پیش کیا ہے۔اسی لیے اس کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بیلی دکنی ادب کے تعارف کراتے ہوئے اپنی اوّلیت کا دعویٰ کرتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تاریخ میں دکنی ادب کا بھرپور تعارف ملتا ہے۔اس طرح بیلی کا اولیت کا یہ دعوی درست قرار نہیں پاتا۔ انھوں نے بالعموم شعراء کے کلام کے نمونے نہیں دیے۔مگر قلی قطب شاہ کی تین نظموں اور وجہی کی دو نظموں کے منظوم انگریزی تراجم دیے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ہے "The First Century of Urdu Poetry in Delhi"۔اس باب میں ایک صدی کے ادب (1730ء تا1830ء) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ابتداء میں مختصر سا سیاسی پس منظر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی پس منظر ہے۔جس میں بیلی بتاتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں فارسی کے بہت سے شعراء داد سخن دے رہے تھے۔اس دور کو مصنف نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور شاہ حاتم کا دور ہے۔ بیلی کے مطابق سادگی اور تشبیہات ، استعارات کا کم استعمال اس دور کی خصوصیت ہے۔عاشقانہ اور تصوف کے مضامین اس دور میں عام ہیں۔

دوسرا دور مظہر، سودا، میر تقی میر اور درد کا دور ہے۔ اس دور کی خصوصیت زبان کی پختگی ہے۔ تصوف کا بھی رنگ اس دور میں خاصا گہرا ہے۔ بیلی اس دور میں شاعری کے دیوان کو حروف ابجد کی ترتیب سے مدوّن کرنے پر اعتراض کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح زبان اور شاعری کی ترقی کے ادوار کا درست اندازہ نہیں ہوتا۔

تیسرا دور مصحفی، انشا اور نظیر کا دور ہے۔ بیلی کے نزدیک اس دور میں شاعری کے مضامین میں کوئی تبدیلی نہیں ۔ بیلی اپنے مطابق بڑے شعرا کی ترتیب قئم کرتا ہے۔ اس کے مطابق پہلے میر تقی میر پھر سودا اور نظیر اور آخر میں میر حسن آتے ہیں اور اردو کی بڑی عظیم نظمیں میر حسن کی سحر البیان اور گلزار ارم اور اثر کی ''خواب وخیال'' ہیں۔ شاعروں کے ناموں اور نظموں کے ناموں کی ترتیب میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ نظموں میں میر اثر کی ''خواب و خیال'' اور میر حسن کی گلزار ارم بڑی اور عظیم نظموں میں شمار نہیں ہوسکتیں۔

چوتھا باب دبستان لکھنو کے بارے میں ہے۔ اس بارے میں جو خیالات بیلی ظاہر کرتا ہے ان پر عبد السلام کی شعر الہند اور سکسینہ کی تاریخ ادب کا رنگ نظر آتا ہے۔ بیلی لکھنو اور دیلی کی شاعری کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''Delhi and Lucknow different in their literary point of view. Lucknow poetry reflected the court. It gave itself up to external things such as outward ornaments,rather than heavy of thought. ......Delhi was less carefull about words and gave more attention to thoughts and subject.'' 30

رام بابو سکسینہ طرز دہلی اور انداز لکھنو کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پر اثر الفاظ میں

کھینچی جاتی ہے۔لکھنو کا طرز شاعری دماغ کوتو متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں
کرتا۔ناسخ اوران کے شاگردون کا کلام اس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے۔ان کی
غزلوں سے اس زمانے کے زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کی ایک مکمل فہرست
مرتب ہوسکتی ہے۔دلی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال
اورفرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔'' 31

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیلی سکسینہ کے خیالات اور انداز سے خاصا متاثر ہے۔اس باب میں بیلی صنف مرثیہ کے متعلق کہتا ہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی بہترین اور باکمال چیز ہے۔

پانچواں باب پھر دہلی کے شعراء کے تعارف پیش کرتا ہے۔اس دور کے شعراء میں غالب،مومن،ذوق،شیفتہ وغیرہ کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔اس باب میں دہلی کے شعراء کے ساتھ رام پور کے چار شاعروں کا بھی تعارف کر دیا گیا ہے۔یہ چار مشہور شاعر امیر مینائی،داغ،تسلیم اور جالال ہیں۔رام پور کی شاعری پر بیلی کا تبصرہ غور طلب ہے۔

"It is difficult to understand upon what the fame of men like Taslim and jalal rates, there odds and lyrics are conventional, their merit is clever expression more than deep feelings. he lyrics contain the usual complaints against the hard hearted, murderous loved one, and describe the torments of the lover with the scars on his heart, the odds are fulsome panegyrics. The new age of urdu poetry had not yet come for them. 32

اس تبصرے سے اس دور کا رنگ شاعری اور انداز فکر ظاہر ہوتا ہے۔جو روایت پرستی

اور کھنگی کی طرف مائل ہے۔ چھٹا باب اردو نثر سے متعلق ہے۔ یہ باب تین حصوں میں منقسم ہے۔

1- ابتدائی دور، 2- فورٹ ولیم کالج کے مترجمین،

3- انیسویں صدی کے اردو نثر نگار

ابتدائی نثر نگاروں میں بیلی دکنی نثر نگاروں کا مختصر جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس جائزے میں وہ نصیر الدین ہاشمی کی ''دکن میں اردو'' اور محی الدین قادری زور کی ''اردو شہ پارے'' اور شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' سے استفادہ کیا ہے۔

اس حصے میں بیلی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو دو کتابوں کا مصنف بتاتا ہے۔ ''معراج العاشقین'' اور ''ہدایت نامہ'' جبکہ جدید تحقیق سے اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ''معراج العاشقین'' خواجہ بندہ نواز کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ ان کی کوئی بھی اردو تصنیف نہیں ملتی۔ بیلی جعفر زٹلی کو کسی مخطوطے میں اس کے نام سے موجود چند سطروں کی بناء پر اردو کے ابتدائی نثاروں میں شامل کرنے کا تکلف برتتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا بیان بھی اس حصے میں ملتا ہے۔ ابتداء میں بیلی گل کرسٹ کی خدمات کا ذکر کرتا ہے اور پھر کالج کے اہم منشیوں، مرزا علی لطف، میر شیر علی افسوس، میر امن، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کی تصانیف کا تعارف کراتا ہے۔ بیلی میر امن کی نثر کو میر تقی میر کی شاعری کے مماثل قرار دیتا ہے۔ مگر یہاں اس کی تنقیدی صلاحیت اور بصیرت نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اس لیے کہ میر امن کی تخلیقی صلاحیتوں کا میر تقی میر کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں سے مقابلہ بے معنی چیز ہے۔ کیونکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ میر کی شاعری اس کی اپنی ذات کی جھلک دکھاتی ہے۔ اس کے جذبات کی گہرائی، اس کے بیان کی سادگی اور لطافت و نزاکت کو میر امن نہیں پہنچ سکتے۔ کیوں کہ میر آپ بیتی بیان کرتے ہیں اور میر امن جگ بیتی۔

اس باب کا تیسرا حصہ انیسویں صدی کے نثر نگاروں کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں وہ اسماعیل شہید، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم القرآن کا ذکر کرتا ہے۔ نیز اسی میں وہ اشک، مرزا جان طپش، رنگین، فقیر اللہ گویا، رجب علی بیگ سرور، غلام امام شہید اور غالب وغیرہ کی نثر تصانیف کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سرسید اور ان کے رفقاء کے نثری کارناموں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی حصے میں نذیر احمد، سرشار کا ذکر بطور ناول نگار کرتے ہوئے ان کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے۔

ساتواں باب ''The New age'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں بیلی کہتا ہے کہ اردو زبان فارسی کے اثر سے آزاد ہوکر اور انگریزی کے اثر میں آکر آسان ہوگئی ہے اور اب اس کا نیا دور شروع ہوتا ہے جسکا آغاز مولانا آزاد اور حالی سے ہوتا ہے۔ جنہوں نے ایسے مشاعروں کا آغاز کیا جن میں نظم کو اہمیت دی گئی اور لوگوں کو شعوری طور پر نظم نگاری کی طف متوجہ کیا گیا۔ بیلی حالی کی مسدس ''مدوجزر اسلام'' کو اردو کی سب سے بہترین نظم قرار دیتا ہے۔

آٹھواں اور آخری باب conclusion ہے۔ اس میں مصنف نے اردو زبان و ادب کے بارے میں اپنے حاصل کردہ مجموعی نتائج بیان کئے ہیں۔ اس کے مطابق شعر و ادب میں نئے زمانے کا اثر حالی اور آزاد سے شروع ہوتا ہے اور خیالات و مواد پر انگریزی زبان و ادب کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ اس باب میں غور کیا جائے تو بیلی اپنی مغربی تہذیب اور مغربی ادب کے معیار کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ہو اعتراف کرتا ہے کہ شاعرانہ زبان اور فارم کے لحاظ سے اردو پر انگریزی زبان و ادب کا اثر نظر نہیں آتا نہ کوئی تبدیلی ملتی ہے۔ اس کے مطابق اس تبدیلی میں سب سے بڑی رکاوٹ فارسی کا اثر ہے۔ اس باب مین مصنف بڑے واضح انداز میں اردو نثر پر عربی و فارسی اثرات پر ناپسندیدگی بلکہ نفرت کا اظہار

کرتا ہے۔وہ عربی و فارسی کو ایسے کیڑے سے تشبیہہ دیتا ہے جو اردو زبان کی قوت نمو ختم کرتا ہے۔

> "Prose has made more advance, than poetry in the last twenty five years. It is less shackled by convention, and though it suffers from the blight of Persian and Arabic, which eat out its vitality, it is free and more vigorous than all but a small part of poetry." 33

بیلی کا یہ خیال بالکل درست نہیں کہ عربی اور فارسی اثرات نے اردو زبان سے قوت نمو چھین لی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی صحیح پرداخت اور نشوونما میں عربی اور فارسی زبان و ادب نے بہت حصہ لیا ہے۔ بیلی کے خیال میں اگر اردو شعراء انگریزی شعراء کا مطالبہ کریں تو وہ اپنی ادبی تخلیقات کے لیے زیادہ وسیع میدان حاصل کر سکتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بیلی قدم قدم پر اردو زبان و ادب کو انگریزی زبان و ادب کے معیارات پر پرکھتا ہے۔اور صرف اسی حصہ کو قابل توجہ اور اہم سمجھتا ہے۔ جو انگریزی زبان و ادب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ بیلی اردو زبان کے مستقبل کی بات کرتے ہوئے اس کی ترقی کی ذمہ داری جہاں اردو بولنے اور لکھنے والوں پر عائد کرتا ہے وہاں چند اداروں کو بھی اس ترقی کا ذمہ دار بناتا ہے۔ یہ ادارے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی اکیڈمی ہیں جو اس دور میں اپنے اپنے میدان میں اردو کی ترقی کے لیے مختلف کارناموں میں مصروف تھے۔

> "The future of urdu depends chiefly on the grat mass of its speakers and writers, but also on the Osmania University in Hyderabad, to some extent too on the anjuman I Taraqi Urdu, with its headquarters in Aurangabad, and the Hindustani academ."

بیلی کی یہ رائے آج بھی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اگر اردو بولنے اور لکھنے والے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے نئے نئے خیالات، الفاظ وتراکیب وغیرہ تلاش کرتے اور وضع کرتے رہیں گے تو زبان کا دامن وسیع ہوتا رہے گا۔ نیز اہم با اختیار اور مقتدر ادارے اپنے وسائل سے کام لے کر ترجمہ وتصنیف کا تازہ خون اس زبان کے وجود میں داخل کرتے رہیں گے۔ تو یہ زبان طاقتور اور توانا ہوتی رہے گی۔

بیلی نے آزاد کی ''آب حیات''، عبدالسلام ندوی کی شعرالہند، سکسینہ کی تاریخ ادب اردو اور شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' کو بالخصوص بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ ان ماخذ میں جو معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ وہ اپنے دور کی تحقیقات کے مطابق درست تھیں۔ مگر موجودہ دور تک آتے آتے نئی تحقیقات کی روشنی میں آج بہت سی معلومات غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہذا بیلی کی تاریخ کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ معلومات جو ان ماخذ کے حوالے سے بغیر تحقیق وتصدیق کے دی گئی ہیں وہ آج درست نہیں ہیں۔ مثلاً ایک جگہ بیلی لکھتا ہے:

> "One writer has remarked acutely that every age of urdu has his pair of poets: one natural, who wrote from the heart, the other artificial, writing more for effects. He mentioned the following writers, the first in each case being the natural poet: Mir and sauda, Mushafi and insha, Atish and nasikh, Ghalib and Zauq, Dag and Amir'' 35

یہاں بیلی نے اس قول کے مصنف کا نام نہیں لکھا جس سے یہ قول مستند نہیں رہتا۔
ان کی تاریخ میں تذکرے کا انداز بہت نمایاں ہے۔ چونکہ یہ ابتدائی دور کی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ جب تذکروں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کے لب ولہجہ اور انداز پر تذکرے کا

رنگ نظر آتا ہے۔ بیلی نے سنین درج کرنے کی طرف خاص توجہ رکھی ہے۔ جو تاریخ کا لازمہ ہے۔مصنف نے اردو زبان وادب کی یہ داستان اپنے ہم زبانوں کے لیے لکھی ہے۔اسی لیے وہ ایسا طرزتحریر اپنایا ہے جو اس کے ہم زبانوں کو سمجھ میں آ سکے۔ بیلی مشرقی تہذیب کی روایات وافکار سے اچھی طرح واقف نہیں۔اسی لیے وہ ان کا درست تجزیہ نہیں کر پاتا۔اردو شعر وادب کا تجزیہ کرتے ہوئے بیلی انگریزی زبان وادب کی روایات اور معیارات کو سامنے رکھتا ہے۔اس کتاب میں رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔مثلاً رام بابو سکسینہ نے پہلی بار نظیر اکبر آبادی کا ذکر کیا ہے۔ بیلی بھی اس کی تتبع میں نظیر کی اہمیت وعظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے نمایاں مقام دیا ہے۔

بیلی اپنی اس کتاب میں صرف مختصر سیاسی حالات پیش کرتا ہے۔مگر اردو زبان و ادب پر ان حالات کے اثرات کی وضاحت ہیں کرتا۔اسی طرح تہذیبی وسماجی اثرات کی عدم موجودگی سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔مگر شاید ایک مختصر تاریخ میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں نکلتی۔ دوسرے اس زمانے میں ان چیزوں کی اہمیت بھی واضح نہیں تھی۔اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔الغرض ادبی تاریخوں میں اس کی اہمیت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

تاریخ نظم ونثر

آغا محمد باقر

آغا محمد باقر کی تالیف ''تاریخ نظم ونثر'' رام بابو سکسینہ کی کتاب کی تلخیص ہے۔ یہ کتاب1933ء میں شائع ہوئی۔

آغا محمد باقر نے دیباچے میں اس کتاب کی تالیف کے دو مقاصد بیان کیے ہیں۔ ایک تو نصابی ضرورت کے لیے سکسینہ کی ضخیم کتاب کی تلخیص آسان زبان میں کرنا اور دوسرے'' آب حیات'' اور مولانا آزاد پر کی جانے والی تنقید کا جواب دینا۔ اور آغا باقر نے اپنے ان دونوں مقاصد میں بہت ہی کامیاب ہوئے۔ انھوں نے 376 صفحات میں اس کام کو مکمل بھی کیا۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ باقر صاحب ایک اچھے تلخیص نگار ہے۔ انھوں نے متن کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اس میں کہیں بھی خامی نظر نہیں آتی۔ مثلاً سکسینہ کی کتاب میں ''اردو ادب کی ترقی کے ابتدائی دور'' کا ایک طویل اقتباس کو انھوں نے یوں سمٹ لیا ہے:

> ''تک بندی ایک فطری عطیہ ہے۔ دنیا کے تمام ادبوں کی ابتداء شاعری سے ہوئی ہے۔ جب تک فن تحریر وجود میں نہیں آیا۔ شعر کے ذریعے واقعات وحادثات دماغ یں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ غیر زبان کی تقلید نثر کی نسبت نظم میں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے ان وجوہ سے نظم کو نثر پر تقدم حاصل ہے۔'' 36

مصنف نے کئی جگہوں پر رام بابو سکسینہ کی قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی جگہوں پر اس سے اختلاف کا بھی اظہار کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مقامات پر جہاں مرزا عسکری یا سکسینہ'' آب حیات'' سے حاصل کی ہوئی معلومات کی عدم صحت

کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر آغا محمد باقر واضح طور پر مولانا آزاد کی حمایت کرتے ہیں۔ اور رام بابو سکسینہ کے بعض تنقیدی بیانات کو بھی ردّ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے بارے میں سکسینہ کی رائے پر تنقید کرتے ہوئے آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''سکسینہ صاحب کا خیال ہے کہ بعض جگہ فارسیت کے غلبہ سے تصنع اور آورد بہت آ گئی ہے۔ کلام میں روانی آواز میں موسیقی، اثر، بلندی خیال ایقاع نظر کے محاسن سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ صریح ناانصافی ہے۔ اقبال کے کلام میں تصنع یا آورد بالکل نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اس وقت شعر کہتے تھے۔ جب شعر ان کو مجبور کر دیتا تھا اور خود بہ خود زبان پر آ جاتا تھا۔ ان کے اشعار ہمیشہ بلند مدارج پر فائز رہتے تھے۔''

یہاں آغا محمد باقر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اقبال کے حالات سکسینہ نے نہیں لکھے بلکہ مرزا محمد عسکری نے اصل کتاب سے علٰیحدہ ضمیمہ میں اقبال کے حالات لکھے تھے۔ لہذا یہ اعتراض سکسینہ پر کرنے کی بجائے مرزا عسکری پر کرنا چاہیے تھا۔

آغا محمد باقر دیباچے میں سکسینہ کی کتاب پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واقعات اور حادثات وغیرہ کے سنین کہیں ہجری سنہ میں ہیں کہیں عیسوی سنہ میں دیے ہیں۔ نیز دونوں سنین میں عدم مطابقت کی وجہ سے قاری کے لیے الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی کتاب اس عیب سے پاک ہے اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ دونوں سنین اکٹھے دیے جائیں تا کہ وقت کو جانچنا آسان ہو جائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اس دعویٰ میں وہ کامیاب نہیں ہیں کیونکہ بہت سی جگہوں پر انھوں نے سنین دیے ہی نہیں یا تحقیق کر کے ان سنین کو دریافت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آغا محمد باقر کے مطابق سکسینہ نے زیادہ تحقیق سے بھی کام نہیں لیا اور اکثر دوسروں کے بیانت اپنی طرف سے نقل کئے ہیں۔ انہوں نے ایسے کئی قابل

اعتراض بیانات سکسینہ کے نام لے کر نقل کیے ہیں اور ان کے جوابات بھی لکھے ہیں۔ مگر یہ جوابات بالعموم ان اعتراضات کے ہیں جو سکسینہ نے مولانا آزاد پر کیے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

> ''آغا محمد باقر نے مرزا عسکری کے ضخیم اردو ترجمے کی تلخیص خوب کی ہے۔ لیکن انھوں نے جا بجا حاشیے اور متن میں مصنف اصلی یا مترجم پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ اکثر صورتوں میں قائل نہیں کرتے خصوصاً ''آب حیات'' سے متعلق ان کا ہر تبصرہ صریحا جنبہ داری معلوم ہوتا ہے۔'' (78)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مرزا باقر کی یہ کتاب ایک اچھی تلخیص کے سوا اور کوئی خوبی اپنے اندر نہیں رکھتی۔ کیونکہ انھوں نے خود بھی بہت کم تحقیق سے کام لیا ہے۔ اور نئی معلومات پیش نہیں کیں۔ علاوہ ازیں سکسینہ یا مرزا عسکری کے تسامحات کو بھی درست نہیں کیا۔ اسی لیے ادبی تاریخوں میں اس کو کوئی اہم مقام نہیں دیا جا سکتا۔

مختصر تاریخ ادب اردو- ڈاکٹر اعجاز حسین

ڈاکٹر اعجاز حسین کی تصنیف 'مختصر تاریخ ادب اردو 1934ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنے دور کی مشہور و مقبول کتاب تھی جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کتاب کا مقصد تالیف بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ تاریخ ادب میں ایسی کتاب کی کمی نظر آتی تھی جو ابتداء سے ان کے عہد تک کا درست حال بتائے۔ نیز شاعروں اور نثر نگاروں پر انفرادی حیثیت سے کوئی تاریخ و تبصرہ پیش کرے۔ علاوہ ازیں طلبہ کی نصابی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اس کتاب کو ترتیب دیا۔ انھوں نے کوشش یہ کی ہے کہ اختصار کے ساتھ پورے ادب کا احاطہ کریں۔ اپنی اس کوشش اور مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ مصنف خود لکھتے ہیں:

> ''اس مختصر تاریخ ادب میں اختصار کا پہلو حالات زندگی لکھتے وقت اور تنقید کلام کے موقع پر بھی مدنظر رہا۔ تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے اگر ممکن ہو تو پارہ کو جملہ میں اور جملہ کو چند لفظوں میں پر معنی طریقہ سے بیان کر دیا جائے۔''

مصنف اپنے اس مقصد سے انصاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتاب کے ہر باب خصوصاً باب کے آخر میں اس دور کی خصوصیات کے بیان میں اختصار اور جامعیت کی خوبی نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔ اے کے طلبہ کی تدریسی ضروریات پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس لیے اس کا یہ اختصار برا محسوس نہیں ہوتا۔

اس دور میں لکھی جانے والی تمام ادبی تاریخوں کی ایک مشترکہ خامی ہمیں اس کتاب

میں بھی ملتی ہے اور وہ خامی یہ ہے کہ ادب کو بطور ادب یا ایک اکائی کے نہیں لیا جاتا۔ بلکہ اسے شاعری اور نثر نگاری کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر کے بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بھی شعراء اور ادبا کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ ملتا ہے۔ ابتداء میں شاعر یا ادیب کا مختصر سا تعارف اور حالات زندگی کا بیان، پھر تصانیف کا مختصر جائزہ اور بس کسی ایک دور کے سیاسی و سماجی حالات کیا تھے اور کسی شاعر و ادیب پر ان کا کیا اثر ہوا، اس کا جائزہ لے کر کسی طرح کی وضاحت نہیں کرتے۔ حالانکہ ایسا جائزہ تاریخ ادب کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سیاسی و سماجی پس منظر سے ہی ان محرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو کسی شاعر و ادیب کی تخلیقات کا باعث بنتے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اس تاریخ کی ترتیب میں ادوار کی تقسیم مبہم رکھی ہے۔ اور ان ادوار کے تحت جن شعراء یا ادباء کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے بیان میں تاریخی، ابجدی کوئی بھی ترتیب نہیں ملتی۔ البتہ انھوں نے ہر دور کے آخر میں اس دور کی خصوصیات کا مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے جس کے باعث تاریخ ادب کا رنگ جھلکتا ہے۔

اس کتاب کے حصہ نظم میں گیارہ باب جبکہ حصہ نثر میں آٹھ باب ہیں۔ حصہ نظم میں مصنف نے دکنی شعراء سے لے کر اپنے دور تک کے شاعروں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ حصہ نثر میں اولاً ابتدائی نثر اردو کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ بعد ازاں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین سے لے کر مصنف نے اپنے دور کے مزاح نگاروں تک کا احاطہ کیا ہے۔ اس طرح اپنے سے پہلی تاریخوں سے یہ کتاب اس حد تک آگے ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے عہد کے شعراء و ادبا کا بھی تعارف و جائزہ پیش کیا ہے۔ البتہ اس میں عمومی طور پر شعراء و ادباء کے نمونہ کلام پیش نہیں کیے ہیں۔

باب اول میں 12 صفحات پر ''زبان کی ابتداء'' کی کہانی ملتی ہے اور اس کے بعد

دکن کے سولہ شعراء کا تذکرہ ملتا ہے۔اس باب میں دکنی شعرا کے تذکرے میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے تین تصوف کے رسالے اردو زبان میں منسوب کیے ہیں جبکہ موجودہ دور کی تحقیق سے ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے یہ بات ثابت کی ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے کوئی بھی اردو رسالہ لکھنا ثابت نہیں۔ بلکہ یہ ان کے عہد کے بعد کی تصنیف ہے۔اس باب کے اخیر میں دکن کی ابتدائی خدمات کے عنوان سے ایک مختصر جائزہ ہے جس میں دکنی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس دور کی مشہور اصناف مثنوی، مرثیہ کا بھی مختصر تجزیہ دیا گیا ہے۔

دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب دہلی کے شعرا سے متعلق ہیں۔ دوسرے باب میں کلہ سات شعراء کا تذکرہ ہے۔ باب کے ابتداء میں سیاسی وسماجی پس منظر نہیں جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ برہمنؔ، فائزؔ، آبروؔ، ناجیؔ، مضمونؔ وغیرہ کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔اور آخر میں مجموعی جائزہ بھی پیش کیا ہے جس میں اس دور کی خصوصیات کا بیان کیا گیا ہے۔ان کے مطابق اس دور میں ایہام گوئی کا غلبہ تھا اور پھر بعد میں یہ خامی شاہ حاتم اور مرزا مظہر کی کوششوں سے دور ہوگئی۔

تیسرے باب میں شاہ حاتم، مرزا مظہر جان جاناں اور فغاں کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کو ایہام گوئی اور بدنما الفاظ سے پاک کیا۔ ان سب لوگوں کے حالات وتذکرہ بہت مختصر دیا ہے جس سے ان لوگوں کی خدمات کا بھی درست طریقے سے اندازہ نہیں ہو پاتا۔ چوتھا باب ان لوگوں کے تذکرے پر مبنی ہے جنھوں نے اردو کو اس کے اعلیٰ ترین معیار پر پہنچا دیا کہ بعد کے آنے والے ان کے مقام تک پہنچنے کی حسرت دل میں لیے رہیں۔ان شعرا میں سوداؔ، دردؔ، سوزؔ، حسنؔ، میرؔ اور یقینؔ شامل ہیں۔ پانچواں باب جراتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور اثر کے نام ہے۔ آخر میں دور کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اس حصہ میں مختلف دس نکات کی

صورت میں ان خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ انداز طالب علمانہ انداز ہے۔ چھٹا باب نظیر اکبر آبادی کے لیے مختص ہے۔ ساتواں باب امیرؔ، داغؔ اور جلالؔ کے نام ہے۔ ان تینوں کا تعلق رامپور دربار سے تھا۔ اپنے انداز کے یہ تینوں شاعر باکمال شاعر ہیں۔ اس دور میں شعرائے لکھنو دلی کی طرف مائل تھے۔

نواں باب مرثیے سے متعلق ہے۔ اس میں انیس و دبیر کا تذکرہ ملتا ہے۔ دسواں باب دور جدید کے عنوان سے ہے۔ اس دور میں حالی اور آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ حقیقت نگاری کا رواج اسی دور میں شروع ہوا۔ اور سیاسی، سماجی پہلو پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ گیارہواں باب دور حاضر سے متعلق ہے یعنی مصنف خود جس دور میں موجود تھا۔ یہ باب خاصا طویل ہے۔ اور اس میں 35 شعراء کا تعارف ملتا ہے۔ جس میں اقبالؔ، فیضؔ، حفیظؔ، فانیؔ، یاسؔ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس دور کی خاصیت یہ ہے کہ لوگوں میں شاعری سے دلچسپی بڑھنے لگیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی چمکنے لگی۔ ترقی پسند تحریک کا عروج اسی دور میں ہوا۔ نظم میں نئی نئی ایجادیں ہوتی رہیں۔

اس باب کے بعد حصہ نثر ہے۔ جو باب اول سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں آغاز میں نثر کی تاریخ بیان کیا ہے۔ اس میں مصنف لکھتے ہیں کہ فضلی کی ''مجلس'' سے پہلے ہی دکن میں نثر کا وجود ظہور میں آچکا تھا۔ مگر فٹ نوٹ میں وہ وضاحت کرتے ہیں کہ داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ کو اولین اردو کا نقش سمجھتے ہیں۔ حامد حسن کے اس دعویٰ پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ خیال غلط ہے کہ دکن میں اردو بہ نسبت شمال کے پہلے تصنیف کی بنیاد پڑی۔
> ضرورت یہ تھی کہ اس کتاب کا پتہ نشان قادری صاحب بتاتے۔ اتنے دعویٰ کے لیے
> ضروری تھا کہ اس نسخہ کو اور لوگ بھی دیکھ سکتے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی خاص اہمیت

ہوتی۔ اس کا شائع ہونا بھی ضروری تھا۔ نہ معلوم صیغہ راز میں یہ کتاب کیوں ہے۔''(ص:280)

یہاں بھی''معراج العاشقین''کو خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف سمجھا گیا۔ جبکہ اب جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ تصنیف خواجہ کی تصنیف نہیں ہے۔

نثر کی تاریخ کے بعد فورٹ ولیم کالج کا تعارف اور اس سے متعلقہ اہل قلم کا مختصر تعارف و تذکرہ دیا گیا ہے۔ اس باب میں میر امن، میر شیر علی افسوس، سید حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری، مرزا کاظم علی جوان، مرزا علی لطف اور بینی نرائن کا تذکرہ ہے۔ مگر یہاں بھی حسب روایت کسی کا بھی سنہ ولادت یا سنہ وفات نہیں دیا۔

حصہ نثر کا اگلا باب ان ادبا پر ہے جو فورٹ ولیم کالج سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان میں رجب علی بیگ سرور، مرزا غالب، ماسٹر رام چندر اور غلام غوث بے خبر قابل ذکر ہے۔ اس حصہ کا تیسرا باب نثر کی ترقی کے عنوان سے ہے۔ اس میں سرسید، محسن الملک، چراغ علی، آزاد، ذکاءاللہ، حالی، سید علی بلگرامی اور شبلی کا تذکرہ ہے۔

چوتھا باب ناول سے متعلق ہے۔ اس باب کا آغاز نذیر احمد کے تذکرے سے کیا ہے۔ نذیر کے علاوہ سرشار، سجاد حسین، رسوا اور راشد الخیری کا ذکر اس میں ملتا ہے۔

پانچواں باب''مقالات وصحافت''کے عنوان سے ہے۔ اس میں مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی اور نصیر حسین کا تذکرہ ہے۔

چھٹا باب تنقید کے حوالے سے ہے۔ اس میں چکبست، عبدالحق، نیاز فتح پوری، مسعود حسن، محی الدین قادری زور، عندلیب شادانی، اختر حسین رائے پوری، آل احمد سرور، وقار عظیم، احتشام حسین کا ذکر اس باب میں ہے۔ اس باب میں تنقید کا تعارف مختصر طور پر کیا

ہے۔اوران تمام ناقدین کا تعارف خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ان کے اسلوب کی خوبیاں اور خامیاں بیان کیا ہے۔

ساتواں باب مختصر افسانہ کے عنوان سے ہے۔اس میں بھی آغاز میں افسانہ کی صنف کا تعارف ہے اور گیارہ افسانہ نگاروں کا تعارف ہے۔ ان میں پری چند، سدرشن، سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش، علی عباس حسینی، مجون، کرشن چندر، اختر رائے پوری اور سعادت حسن منٹو کا ذکر ملتا ہے۔اس میں بھی وہ تمام افسانہ نگاروں کی ذاتی خصوصیات کو بڑے اچھے انداز سے واضح کر دیتے ہیں۔آٹھواں باب مزاحیہ افسانے کے عنوان سے ہے۔اس میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، ملاء رموزی، شوکت تھانوی، کنہیالال کپور کا ذکر ہے۔

آخر میں اختتام کے عنوان سے ڈاکٹر اعجاز حسین کی ایک تحریر ہے۔اس میں وہ اردو زبان کی حیثیت ووقعت پر روشنی ڈالتے ہیں۔اردو زبان پر آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں پر کیا گزر رہی ہے۔اس کا اظہار بڑی دردمندی سے اس مضمون میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کی اس تاریخ کی فہرست کی ترتیب وہی ہے جو سکسینہ کی تاریخ ادب کی اور اگر دیکھا جائے تو اس دور کی زیادہ تر تالیفات پر سکسینہ کی تالیف کا اثر ہی نظر آتا ہے۔مثلاً نظیر اکبرآبادی کے لیے الگ باب رکھنا، ناول، تنقید کے عنوانات قائم کرنا سب سکسینہ کے زیر اثر ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی تاریخ کے لیے مولانا آزاد کی ''آب حیات'' سے کافی استفادہ کیا ہے اور ان کی معلومات کو اسی طرح پیش بھی کیا ہے۔اس کے علاوہ تذکروں میں ''مجموعہ نغز'' اور ''خم خانہ جاوید'' سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ شمس اللہ قادری کی ''اردوئے قدیم'' ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ''اردو شہہ پارے'' اور ''دکن میں اردو'' اور حامد حسن قادری کی ''داستان تاریخ اردو'' سے بھی مدد لی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کا انداز تحریر سادہ اور شگفتہ ہے۔ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنی بات بیان کرتے ہیں۔ ان کے بیانات میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں۔ وہ شعرا اور ادبا کی فنی خصوصیات کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر بیان نہیں کیا گیا جس کے باعث ان شعرا و ادبا کا سماج سے کیا تعلق ہے اور ادب پر ان معاملات کیا اثر پڑی ہے اس کی وضاحت کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

داستان تاریخ اردو۔مولانا حامد حسن قادری

ادبی تاریخ کی یہ کتاب 1941ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ضخیم کتاب پورے اردو ادب کی داستان نہیں ہے بلکہ صرف نثر نگاروں کے حالات وکوائف پر مبنی ہے۔ اس کتاب سے پہلے اردو نثر پر لکھی جانے والی کتابوں میں کوئی بھی مکمل طور پر اردو نثر کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ خاص کر نمونوں کی عدم موجودگی سے ادھورے پن کا احساس رہتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہی مصنف نے اس کتاب کا آغاز کیا۔ وہ خود لکھتا ہے:

> ''میں نے داستان تاریخ اردو میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے۔ تاریخ وار ارتقائے اردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کئے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔''

چنانچہ انھوں نے تمام مصنفوں کے طویل اقتباسات اور نمونے پیش کیے ہیں جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ کئی جگہوں پر انھوں نے ایک ہی مصنف کی تین تین کتابوں سے کئی کئی صفحوں کے اقتباسات دیے ہیں۔

اس کتاب کا آغاز حسب روایت لسانی مباحث سے ہوتا ہے۔ اس حصے کو دو عنوانات کے تحت لکھا گیا۔ ایک آغاز اردو سے پہلے اور دوسرا آغاز اردو۔ پہلے حصے میں اردو زبان کی تحقیق، زبان ہندی، زبان ریختہ اور زبان کے لیے لفظ اردو کا استعمال وغیرہ کی بحثیں ملتی ہیں۔ ان مباحث میں وہ اردو زبان کے آغاز اور خاص اردو کے لفظ کے استعمال کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ اس نوعیت کی بحثیں بالعموم اس دور کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ جن سے مصنف نے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ مگر ان میں جو تحقیقی غلطیاں ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

آغاز اردو کے عنوان کے تحت فارسی شاعری میں ہندی الفاظ اور فارسی شاعروں کے ہندی کلام کا تعارف کراتے ہیں۔ اس دوسرے حصے میں اردو زبان کی ابتدائی کیفیت اور اہمیت کا حال بیان کرتے ہیں اور پھر ''نثر اردو کا پہلا دور'' کے سلسلے میں دکن میں سلطنت بہمنی اور قطب شاہی و عادل شاہی حکومتوں کے تحت اردو زبان کی تاریخ اور اہم شاعروں کا ذکر کرتے ہیں اور اس باب میں شیخ گنج العلم کو اردو کا پہلا مصنف ''معراج العاشقین'' کو خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب کرتے ہوئے اردو کی پہلی نثری کتاب قرار دیتے ہیں۔ نثر کا دوسرا دور شمالی ہند سے متعلق ہے۔ جو 1732ء سے لے کر 1799ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور کے نثر نگاروں میں فضل علی فضلی، مرزا رفیع الدین سودا، شاہ عبد القادر، میر عطا حسین خان تحسین کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ حامد حسن قادری نے یورپین مصنفین کے تذکرے میں ڈاکٹر گل کرسٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل بتاتے ہیں۔ جبکہ جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ صرف ہندوستانی شعبہ کے پروفیسر تھے۔

نثر کا تیسرا دور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین سے لے کر رجب علی بیگ سرور تک ہے۔ یہ دور 1800ء سے 1820ء تک ہے۔ اس میں پندرہ مصنفین کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

اور بعد میں اس کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج سے باہر کے مصنفین کا تذکرہ ہے۔ ان کا دور 1801ء سے 1830ء تک ہے۔ اس حصے میں آٹھ مصنفین کا تعارف ملتا ہے۔ اکثر مصنفین کے ولادت ووفات کے سنین نہیں لکھے۔

نثر کا چوتھا دور 1831ء 1870ء تک ہے۔ اس کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

> ''یہ چوتھا دوران کے بعد کے مصنفوں کا ہے جن کا زمانہ تصنیف غدر سے پہلے یا کچھ بعد کا ہے۔ یہ تیسرے اور چوتھے دور کی علیحدگی کسی خاص ادبی اور لسانی تغیر کے اصول پر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی کا نصف اوّل بلکہ دوثلث تقریباً یکساں ہیں۔'' (ص:202)

اس دور میں 24 اہل قلم کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں فقیر محمد گویا، امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر، آغا امانت علی، مرزا غالب جیسی ہستیاں موجود ہیں۔ مرزا غالب کا حال بہت تفصیل سے لکھا ہے اور ان کا انداز بیان کا بھی جائزہ لیا ہے۔

چوتھا دور دکن کے شاہ علی کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کو یہاں ختم کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ سرسید کے زمانے میں اردو زبان وادب میں نمایاں انقلاب کا آغاز ہوا اور انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے آئندہ ادبی انقلاب اور علمی ترقی کا راستہ واضح ہونا شروع ہوگیا۔

نثر اردو کا پانچواں دور 1871ء سے 1900ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کو تین حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے سرید کا تعارف اور ان کی کتابوں کے نمونے میں نیز تہذیب الخلاق، سرسید کے خطوط اور تقریر کا نمونہ بھی ہے اور سرسید کی تضریر کی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں۔

پھراس دور کے غیر مشہور مصنفین کا بیان ہے جس میں وہ ایسے بارہ افراد کا تعارف کراتے ہیں۔ جنہوں نے ادبی کی بجائے علمی نثر لکھی۔ ان میں سید محمد میر لکھنوی، یوسف خاں کمبل پوش، شاہ محمد قاسم داناپوری مفتی اکرام اللہ صدیقی، حکیم قطب الدین باطن اکبرآبادی، مفتی امیر احمد مینائی اور پنڈت گرراج کشوردت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس دور کے مشاہیر ادب کے حصہ میں نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی کے تذکرے ہیں۔ یہ اصحاب سرسید کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ مگر ہم ان کو صاحب طرز ادیبوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد اس دور پر مجموعی تبصرہ بھی کیا ہے۔

نثر اردو کا چھٹا دور" غدر کے بعد" یعنی 1857ء سے شروع کر کے بیسویں صدی کے آغاز یعنی 1900ء تک ختم کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات عجیب لگتی ہے کہ پانچویں دور کا زمانہ 1871ء سے شروع ہو کر 1900ء تک ختم ہوتا ہے۔ اور چھٹے دور کا آغاز غدر کے بعد یعنی 1857ء سے پھر کیا جاتا ہے۔ پانچویں اور چھٹے دور میں فرق صرف نثر کی خصوصیات کے باعث ہے۔ اس دور میں نو مشاہیر ادب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی وغیرہ قابل ذکر ہے۔ مصنف کے مطابق اس دور میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیب پیدا ہو سکتے تھے وہ سرسید سے شبلی تک پیدا ہو گئے تھے۔ یہ تمام اسالیب انگریزی زبان وعلوم سے متاثر ہیں۔

حامد حسن کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ماخذ کا تعارف کرتے ہیں۔ ان کے ماخذ میں شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تحریریں شامل ہیں۔ انھوں نے ہر دور کے آخر میں تبصرہ بھی دیا ہے۔ وہ اپنی رائے کو بڑے اچھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

حامد حسن قادری نے بہت سے اہم مباحث حاشیوں میں بیان کئے ہیں۔ ان

مباحث کو اگر ضمیمہ میں رکھ دیے ہوتے تو کتاب کی حسن میں اور اضافہ ہو جا تا تھا۔ یہ تاریخ صرف نثر کی تاریخ ہے۔ اس میں مذکورہ نثر کے ادوار کے ضمن میں وہ سیاسی، سماجی ماحول اور ادب پر اس کے اثرات کی وضاحت نہیں کرتے۔

A History of Urdu literature

by M.Sadiq

یہ کتاب 1964ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا بنیادی خاکہ کلاسیکی ادبی تاریخوں کا ہے۔ اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ قدیم ابتدائی اردو شاعری کے تعارف اور تاریخی پس منظر سے شروع ہو کر غالب کے دور تک گیارہ ابواب پر محیط ہے۔ اس حصے کے اختتام پر اس پورے دور کا ایک مختصر مجموعی جائزہ ہے۔ دوسرا حصہ جدید ادب سے متعلق ہے۔ اس میں کل سولہ باب ہیں۔ جو جدید دور کے تاریخی پس منظر سے شروع ہو کر جدید ادب کی خصوصیات، علی گڑھ تحریک، اقبال اور اردو ادب کی مختلف اصناف کے مختصر تعارف کے بعد مجموعی تجزیہ پر ختم ہوتا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر صادق اس کتاب لکھنے کا مقصد اور اپنے تجزیاتی طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہیں جس کے مطابق اس کتاب کا مقصد اردو ادب کے باذوق قاری اور طلبہ کے لیے دکنی دور سے اقبال و حفیظ کے موجودہ دور تک کا تنقیدی جائزہ لینا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ‘‘main object in preparing this book has been to offer an interpretation of the works of the leading witers in intimate association with there career and

the conditions and influences that acted as formative facts in the development of their minds”

اس کے ساتھ ڈاکٹر صادق اپنے تجزیاتی طریق کار کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے لیے انھوں نے تاریخی اور سوانحی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ محتاط نفسیاتی طریق کار بھی اختیار کیا ہے۔ پہلا باب تاریخی پس منظر سے متعلق ہے۔ اس باب میں وہ ادبی، سماجی اور معاشی صورت حال پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے جائزہ لیتے ہیں کہ عہد گزشتہ کی یہ سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی روایات ادب پہ کیا اثر ڈالتی ہیں۔ ان کے مطابق کسی ادب کو سمجھنے کے لیے گزشتہ ادوار کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب کی جڑیں ماضی کے حالات و واقعات میں پیوست ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صادق واضح کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو دیکھیں تو حکومتوں کے طرز عمل میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی بلکہ روایات کا مضبوط سلسلہ نظر آتا ہے۔

دوسرے باب میں ابتدائی یا قدیم شاعری کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور شاعری کی اصناف غزل، قصیدہ اور مرثیہ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صادق کے مطابق اردو شاعری فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ اس فارسیت کے زیر اثر اس میں تازگی کا احساس نہیں ملتا۔ ڈاکٹر صادق مزید کہتے ہیں کہ اردو شاعری اپنے لب ولہجہ، موضوعات اور خیالات کی وجہ سے فارسی شاعری کا تسلسل محسوس ہوتی ہے۔ اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے ان کا لب ولہجہ اردو زبان و شاعری دونوں سے بیزاری کا احساس لیے محسوس ہوتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ صرف اسی وجہ سے وہ اردو زبان و ادب کو انتہائی کمتر خیال کرتے ہیں۔ یہاں وہ گراہم بیلی کے اس احساس نفرت کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں جو اسے عربی، فارسی سے ہے۔ اصناف کی تعریف میں انوں نے صنف غزل کا خصوصی تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ غزل کی روایتی تعریف بیان کرتے ہیں کہ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت انتشار پسندی ہے۔

تیسرے باب میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے ادب کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اس میں وہ ابتداء میں دکن کا سیاسی پس منظر بیان کرتے ہیں۔ دکنی زبان و ادب پر وہ فارسی اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی کلچر کا اثر بھی دیکھتے ہیں۔ بیجاپور کی ریاست کے بہت سے شعراء میں وہ کمال خان رستمی اور نصرتی کو قابل التفات سمجھتے ہوئے ان کے فنی شہہ پاروں کا تعارف کراتے ہیں اور گولکنڈہ کی ریاست میں قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اور ابن نشاطی کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق دکنی ادب کے ضمن میں صرف ڈاکٹر عبدالحق کو ایسا محقق مانتے ہیں جنھوں نے دکنی ادب کو روشناس کرایا۔ اس مختصر باب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس قدیم دور کے ادب سے کوئی خاص شغف اور واقفیت نہیں ہے۔

چوتھا باب پہلے باب کی توسیع ہے اور اس میں ولی دکنی اور ان کے معاصر شعرا کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس باب میں مختصر سیاسی پس منظر ہے، جس میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کے خاتمے کا ذکر ہے۔ ان کے مطابق اورنگ زیب عالمگیر کی دکن کی صوبہ داری کے نتیجے میں دکنی زبان پر شمال کی زبان کا گہرا اثر پڑا اور نئی زبان اورنگ آبادی کہلائی جو اپنے محاورے لب ولہجہ وغیرہ میں دہلی کی اردو کے مماثل تھی اور مقامی دکنی زبان کے ساتھ ساتھ شمال کی زبان سے متاثر اورنگ آبادی اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ولی کے معاصرین میں مرزا داؤد اور سرج الدین کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ دونوں ولی کے دور کے بعد کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری پر ولی کے فن کا گہرا اثر ہے اور وہ ولی کے فن کے معترف بھی ہیں۔ ڈاکٹر صادق ان کے فن کا تنقیدی جائزہ نہیں لیتے۔

پانچواں باب ''اردو کی حمایت میں ردعمل'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں صادق اورنگ زیب کی وفات کے بعد کا سیاسی پس منظر اور مغل حکومت کے زوال تک کی سیاسی

کہانی بیان کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ادبی ماحول میں تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس ادبی ماحول میں فارسی اور اردو کی آویزش جاری تھی۔اس باب کے آخر میں صادق صاحب اردو کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں دو حقیقتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ان کے مطابق شمالی ہند میں فارسی پر اردو برتری ایک فطری عمل تھا جو فارسی زبان کی برتری کے خلاف تھا اور دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی ترویج وترقی کا یہ عمل ان لوگوں نے شروع کیا تھا جو خود فارسی تہذیب وتمدن کے پروردہ تھے مگر فارسی، ایرانی زبان وتہذیب کی برتری سے نالاں تھے اور اپنی مقامی زبان کو آگے لانا چاہتے تھے۔

چھٹے باب کا عنوان ہے ''اردو شاعری کا دہلی اسکول، دور حاتم حصہ اول''۔اس حصے میں ایہام گوئی پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔لفظ ایہام کے معنی، اردو زبان وشاعری میں اس کے فروغ وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر صادق خاصی طویل سے ذکر کیا ہے۔وہ اس باب میں چند نمائندہ ایہام گو شعرا کا تعارف کراتے ہیں اور انہی کے ساتھ رد عمل کے شاعر شاہ حاتم کا ذکر بھی کرتے ہیں۔اور ان کے کلام کا نمونہ انگریزی ترجمے کے ساتھ پیش بھی کیا ہے۔

ساتواں باب اردو شاعری کا دہلی اسکول کے عنوان سے ہے۔یہاں وہ مختصر ادبی پس منظر میں کہتے ہیں کہ گزشتہ دور میں جو ایہام گوئی کا دور تھا اردو ادب میں کچھ ترقی کے آثار نظر نہیں آتے۔مصنف کا کہنا ہے کہ میر تقی میر، مرزا سودا اور میر درد کی اہمیت اس لیے ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جہاں اسے زوال کا ڈر نہیں۔یہاں وہ ایک اہم بات کہتے ہیں جو ہر دور میں ادب کی پرکھ کا معیار بن سکتی ہے۔

> "The quality of literature available at a certain determined by the availability of genius in it:" (106)

اردو شاعری کے دور زریں کے ایک اہم ترین رکن اور نادر روزگار شخصیت مرزا رفیع سودا ہیں۔ ڈاکٹر صادق نے اپنی تاریخ میں ان کا سنہ ولادت 1713ء بتایا ہے۔ اور میر تقی میر کا سنہ ولادت 1722ء دیا ہے۔ جبکہ جمیل جالبی اپنی تاریخ میں یہ 1706 اور 1722ء دیا ہے۔ محمد صادق شعراء کے سنہ ولادت اور سنہ وفات تذکروں سے اخذ کی ہے۔ لیکن انھوں نے اسے ہجری میں دیا ہے۔ جبکہ تذکروں میں سنین ہجری میں دی تھی۔ ہجری سنہ کو اگر عیسوی میں بدل دیے تو دو عیسوی سنہ دیتے ہیں۔ تا کہ غلطی کا امکان کم ہو۔

آٹھواں باب نظیر اکبر آبادی سے متعلق ہے۔ سکسینہ کی پیروی کرتے ہوئے صادق بھی نظیر اکبر آبادی کو الگ ایک باب میں جگہ دی ہے۔ ڈاکٹر صادق نظیر اکبر آبادی کو بیرنس (Burns) کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انگریزی کے عام قارئین کو اردو شعراء کی اہمیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انگریزی شعراء کی فنی خوبیوں سے واقف ہے۔ اس لیے اردو شعراء کو انگریزی شعراء سے مماثل کر کے انگریزی قارئین کو اردو ادیبوں کے بارے میں صحیح معلومات ہوتی ہیں۔ نظیر کے بارے میں صادق لکھتے ہیں۔

"Nazir is an inspired vagabound and belongs to
the same class as Burns and Vilon:(ص"154)

اس باب میں انھوں نے یہ بتا تا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کا احساس اور اظہار سب سے پہلے S.W Fallon نے اپنی کتاب Hindustani English Dictionary کے دیباچے میں کیا ہے۔ اردو کے قدیم تذکروں میں نظیر کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

نواں باب اردو شاعری کا لکھنو اسکول سے متعلق ہے۔ اس میں وہ مختصر طور پر لکھنو کے شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں کے نمائندہ اشخاص کا تعارف اور ان کے فن کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آغاز میں ڈاکٹر صادق اودھ کی ریاست کا سیاسی پس منظر کو بیان کرتے ہیں جس کا

باقائدہ آغاز 1723ء میں نواب برہان الملک سعادت خان کی اودھ کی صوبہ داری سے ہوا۔مگر لکھنو کو صحیح عروج شجاع الدولہ کے دور میں حاصل ہوا اوراسی کے دور ہی میں دہلی کے اہل کمال نے دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد لکھنو کا رخ کرنا شروع کیا۔ڈاکٹر صادق دبستان لکھنو کا ادبی پس منظر بھی بیان کرتے ہیں۔اٹھارہویں صدی کی معتبر ادبی ہستی ''خان آرزو'' نے بھی دہلی کی تباہی کے بعد لکھنو کا سفر کیا۔ڈاکٹر صادق خان آرزو کے لکھنو پہنچنے کا سنہ 1752ء بتاتے ہیں جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق خان آرزو نواب سالار جنگ کے ہمراہ 1754ء کے بالکل آخر میں لکھنو پہنچے۔

ڈاکٹر صادق دبستان لکھنو کا مزاج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور کے دو اہم عنصر مذہب پرستی اور عیش وعشرت ہیں۔جو اس دور کے ادب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔یہاں وہ لکھنوی ثقافت اور تہذیب وتمدن پر نظر ڈالتے ہیں۔ڈاکٹر صادق اہل دلی اور اہل لکھنو کے ماحول مزاج وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہیں اورادبی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق اہل لکھنو زبان کے استعمال میں دہلی کے شعراء سے زیادہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اوران کی یہ مہارت غزل کی صنف میں زیادہ نظر آتی ہے۔ڈاکٹر صدق دبستان لکھنو کے چند نمائندہ شعراء کا تعارف اور فنی تجزیہ کرتے ہیں۔سب سے پہلے ڈاکٹر صادق شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا تعارف کراتے ہیں اوران کا سنہ پیدائش 1748ء متعین کرتے ہیں۔ان کے بارے میں صادق لکھتے ہیں کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچتے تھے۔ان کا کوئی خاص انداز نہیں تھا۔وہ کبھی میر کے لہجے میں کبھی سودا کے یا کبھی درد کے لہجے میں غزل کہتے تھے۔

انشا کو انھوں نے مصحفی کا شاگرد قرار دیا ہے۔انشا کے کلام کا نمونہ انگریزی ترجمے کے ساتھ دیے ہیں۔اوراس کا فنی تجزیہ بھی شامل کیا ہے۔اس کے علاوہ انشا کی نثری کارناموں کا

جائزہ بھی لیا ہے۔جس میں رانی کیتکی کہانی اور دریائے لطافت کا تعارف اور تجزیہ بھی شامل ہیں۔

اس باب میں امام بخش ناسخ، حیدر علی آتش، پنڈت دیا شنکر نسیم کا بھی ذکر کیا ہے۔دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کا موازنہ میر حسن کی سحر البیان سے کرتے ہیں۔

> " Sihr ul bayan and Gulzar e Nasim belong to different genres. The former is to the latter what Bag o Bahar is to Fasana e Ajaib. The one natural and simple, the other a tour de force in a highly artificial and self conscious style. Structurally too, Nasim's poem is much inferior to Mir Hasan's masnavi" (ص:194)

اس کے بعد ریختی کے موجد رنگین اور جان صاحب کا مختصر تعارف اور صنف ریختی کا مختصر تعارف دیا ہے۔اسی میں مرزا شوق کی مثنویوں کا تعارف بھی کیا ہے۔اس باب کے آخر میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا تذکرہ ملتا ہے۔

دسواں باب صنف مرثیہ سے منسوب ہے۔مرثیہ کا آغاز اور اس کا پس منظر پر مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔مصنف کا کہنا ہے کہ ولی کے دور میں بیجاپور اور گولکونڈہ کے شیعہ حکمرانوں کی وجہ سے دکن اور گجرات میں اس صنف کا آغاز ہوا۔دکنی مرثیے سادگی، اختصار اور موسیقیت کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ڈاکٹر صادق بطور نمونہ دو دکنی مرثیے انگریزی ترجمے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد مرثیے کے دو اہم ستون میر انیس اور مرزا دبیر کے فن پر بحث کیا ہے۔

ڈاکٹر صادق مرثیے کے واقعاتی کردار پر اعتراض کرتے ہوئے اسے مرثیے کی خامی تصور کرتے ہیں۔ان کے مطابق مرثیہ نگار کربلا کی پوری کہانی ایک نظم یا مرثیے میں بیان

نہیں کرتا بلکہ صرف کسی ایک واقعہ کو ایک نظم میں بیان کرتا ہے، جس سے صحیح اور بھرپور تاثر نہیں بنتا۔ ان کے مطابق اگر ایک نظم میں ایک واقعہ کے بجائے پوری کہانی بیان کی جائے تو نظم یا مرثیہ زیادہ پر تاثیر ہو جاتا ہے۔ البتہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مرثیہ نگاروں نے اردو زبان کو بہت وسعت دی۔

> "The marsiya writers have widened the scope of Urdu poetry, and consequently that of urdu language. They have not only enriched the language, they have given it polish, vigour, and flexibility. No less have they enrich the style. They are the first to add rhetoric to poetry"
> (ص: 212)

آخر میں میر انیس اور مرزا دبیر کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں اور دونوں کے فن کا تقابل کرتے ہوئے آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> "My own impression is that is their descriptive passages both are false and exaggerated, Dabir more than Anis. In narrative, both are simple and mater of fact, Anis a little more than Dabir. In another respect Anis is as much ahead of Dabir, he has a finer feeling for language" (ص:226)

گیارہواں باب غالب کا زمانہ کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر صادق اس دور کا معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے ایک پیچیدہ اور مشکل دور قرار دیتے ہیں۔ یہ دور سترہویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے درمیان 1857ء تک محیط ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں انگریزی تہذیب ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے میں دھیرے دھیرے اثر ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر

صادق اس پس منظر کے حوالے سے یہ بات واضح کرتے ہیں کہ اس دور کے شعراء اور ان کے کلام کو ان کی اپنی مغلیہ تہذیب کے حوالے سے دیکھنا چاہیے۔ اس دور کے مشہور نمائندہ شعراء غالب، ذوق اور مؤمن ہیں۔ جن کا ان حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دور میں لکھنوی شاعری کا عروج تھا۔ ذوق اسی لکھنوی شاعری پر فریفتہ تھے۔ لیکن غالب اور مؤمن نے اس رنگ سے ہٹ کر فارسی رنگ شاعری میں اپنایا۔ ذوق کے تذکرے میں ذوق کے رنگ فکر اور شاعری پہ بڑی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق کے مطابق ذوق کے ہاں ان کے پورے دور کی جھلک واضح ملتی ہے زبان کی تراش خراش کی طرف توجہ، نئے خیالات کی کمی، بے رنگ اخلاقیات اس دور کی اہم خصوصیات میں جو ذوق کے ہاں واضح ملتی ہیں۔ ان کے مطابق ذوق کے ہاں فکری بلندی نہیں ملتی۔ وہ عام لوگوں کے لیے لکھتے ہیں اور ان کی ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صادق ذوق اور سودا کا موازنہ کرتے ہیں اور ان دونوں میں بہت سی مشترک خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلا دونوں زبان کی صحت پر زور دیتے ہیں۔ دونوں لمبی بحروں میں غزلیں کہتے ہیں۔ دونون قصیدے میں نام رکھتے ہیں اور قصیدے میں بھی ایک جیسی خصوصیات رکھتے ہیں۔

مؤمن کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

"In my opinion, Momin is not appreciated by the reader today because he appeals to a taste that is rapidly on the decline:(ص".238)

اس کے بعد غالب کا ذکر آتا ہے۔ غالب کے بارے میں خاصا تفصیل سے انھوں نے لکھا ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر مفصل بیان ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت پر ڈاکٹر صادق کا کہنا یہ ہے کہ:

"Ghalib was a man of the world, endowed with a

genius for poetry. Beyond this, neither in his virtue nor in vices in their heroic. The only remarkable thing about him,is his poetry. He was an accomplished courtier and had the virtues and defects peculiar to that class. As an astute man of the world he belived that he must stand well with those who could dispense patronage. He was always eager to make new contacts because they are useful :(ص:247)

غالب کے فنی تجزیے میں وہ ان کی شخصیت کا اظہار کہتے ہیں۔

"His themes are the usual themes of urdu poetry, and the fact that he made a deliberate departure from the style of his predecessors and contemporaries does not change the conventional nature of his poetry. At the same time, as in other poets, his ghazals are interporsed with intimately personal utterances, and it is in these alone that his inner life is to be sought."
(ص :249)

ڈاکٹر صادق کا غالب کے کلام کا تنقیدی جائزہ کہیں کہیں درست معلوم نہیں ہوتا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں جذبے کی کمی ہے۔ اس بات سے ہم کبھی ڈاکٹر صادق سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ انھوں نے غالب کا مقابلہ انگریزی شاعر میرڈتھ Meredith سے کرتے ہیں۔

......"Similar as Ghalib's mind was to the mind of Meredith. We find at work in him a reverse process. He began where Meredith ended."
(ص:275)

غالب کے بعد سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مصنف اختصار سے کام لیا ہے۔ ظفر کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ظفر کی شاعری میں لکھنو کا رنگ نظر آتا ہے۔ اور اس کی شاعری میں اداسی اور مایوسی کی کیفیت ہے جو اس کے ذاتی حالات کا عکاسی ہے۔

حصہ اول کے آخر میں نتیجہ کے عنوان سے تین صدیوں پر محیط ادب کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور یہاں ادب سے مراد صرف شاعری ہی ہے۔ ڈاکٹر صادق کے مطابق گزشتہ تین سو سالوں میں جو اردو شاعری کی گئی وہ سوچ، خیالات، مضامین اور زبان کے اعتبار سے فارسی شاعری کی نقل ہے۔ اس میں مقامی رنگ معدوم ہے۔ غزل اس دور کی اہم صنف ہے جو فارسی غزل کا دوسرا روپ ہے۔ ان ادوار میں ہندوستان ایرانی تہذیب کے زیر اثر تھا۔ ان اثرات کو ڈاکٹر صادق فارسیت زدگی کہتے ہیں اور اس سے خاصے نالاں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اردو شاعری بھی اسی فارسیت زدگی کا شکار ہے اور یہاں کا مقامی رنگ اس میں معدوم ہے۔

اس کے بعد دو صفحوں کا مختصر سا مضمون فورٹ ولیم کالج پر ہے۔ اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے اردو لٹریچر کی ترقی میں کوئی براہ راست حصہ نہیں لیا اور صرف مختلف ترجمے کی کتابیں ہی پیش کیں اور صرف اسلوب ہی پر وہاں کے لکھنے والوں کا زور رہا۔

اس باب میں انھوں نے صرف ایک ہی کتاب کا تعارف پیش کیا ہے۔ وہ میر امن کا باغ و بہار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "Fort William literature has aroused a great deal of attention on account of the service is believed to have rendered to the cause of Urdu. That is a w a y , it marks the beginning of modern urdu prose may be conceded. But it is important to

remember that it stands outside the main current of urdu prose and as such has no place in its evolution, it did not grow out of the soil but was artificially cultivated by a few scholars working under officials instruction.” (ص:291)

ڈاکٹر صادق نے فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں کا جائزہ نہیں لیا ہے۔ چند ادیبوں کے نام کے علاوہ زیادہ مواد اس میں شامل نہیں ہے۔

بارہویں باب سے دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ جو 1857ء کے بعد کے ادب پر محیط ہے۔ اس باب میں انھوں نے سماجی اور معاشرتی پس منظر کا بیان کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کا آخری حصہ ان کے نزدیک سماجی و سیاسی تبدیلی کا زمانہ ہے۔ مغرب اور اس کی تہذیب ہندوستان کے ادب اور زندگی پر چھا رہی تھی۔ اور اس دور کو ڈاکٹر صادق Indian renaissance کا نام دیا ہے۔ جدید دور کے پس منظر میں وہ کئی تحریکوں، اداروں اور شخصیتوں کا تعارف راتے ہیں۔ جنھوں نے ایک طرف معاشرے کو متاثر کیا تو دوسری طرف ادب پر بھی ان کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان میں چھاپے خانے، علی گڑھ تحریک، دہلی کالج، انجمن پنجاب، وغیرہ شامل ہیں۔

تیرہویں باب 1857ء کے بعد کے دور کا احاطہ کرتی ہے۔ اس باب کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوتا ہے۔ سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ادب پر کس قدر عائد ہوتی ہے اس کا تجزیہ بھی اس باب میں کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کی کاوشوں سے ادب میں اور لوگوں کے ذہن میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حقیقت پسندی کا رجحان عمل میں آیا۔ سماج کی اصلاح کو موضوع بنایا گیا۔ ڈاکٹر صادق کے مطابق سکولر انداز فکر اس دور کی اہم خصوصیت ہے۔ جدید ادب کی ایک اہم خوبی زندگی اور اس سے متعلق مسائل سے دلچسپی لینا ہے۔ اور ادب میں انسانیت دوست اور اصلاحی

قدریں وجود میں آنے لگیں۔ ادیب اور فنکار کو پوری طرح کی آزادی حاصل ہوئی۔ اپنے ذہن کو کھل پیش کرنے کا موقع ملا۔ روایت کو توڑنے کی ہمت عطا ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر صادق کے مطابق اس دور میں نثر کے مقابلے شاعری میں بہت کم تبدیلیاں آئیں۔ 1857ء تک کے نثر میں شاعری کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ اور مسجع و مرصع زبان کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن 1857ء کے بعد انگریزی ادب کے اثر سے نثر کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ آسان اور بول چال کی زبان استعمال کرنے لگیں۔ اور مختلف نثری اصناف وجود میں آنے لگی۔

چودھواں باب میں سرسید اور ان کے رفقا کا تعارف ملتا ہے۔ اس باب کا آغاز سرسید سے کیا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد سرسید کے خاص رفقا مولانا حالی، مولانا شبلی کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے ساتھ مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، مولوی وحیدالدین سلیم، نواب محسن الملک جیسی شخصیتوں کا بھی ذکر مختصراً کیا ہے۔

پندرہواں باب مولانا محمد حسین آزاد پر مبنی ہے۔ آزاد کی کتب کا جائزہ اس میں ملتا ہے۔ نیرنگ خیال، سخندان فارس اور آب حیات پر تنقیدی مطالعہ بھی اس میں شامل ہیں۔ ”آب حیات“ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> “. . . My personal view is that Abe Hayat is a carefully documented book. Its sources are 1 (The old Tazkiras mentioned by author in the text or footnotes, of which by the most important is Tazkra e Sjuara e Urdu by Hakim Qasim Mir Qudratulla Qasim 2 (Oral information obtained from the friends and relatives of the poets and 3(Material obtained by correspondence.”(ص:382)

سولھواں باب اکبرالہ آبادی سے متعلق ہے۔اور یہ پہلی کتاب ہے جو اکبرالہ آبادی کا الگ ایک باب میں جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر صادق نے خاصی تفصیل سے اکبرالہ آبادی کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔اوران کی فنی حیثیت ومقام کوواضح کیا ہے۔

سترہویں باب ناول نگاروں کے بارے میں ہے۔اس میں بھی ناول کا بطور صنف تعارف نہیں کیا ہے۔ بلکہ چندنمایاں ناول نگاروں کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔سب سے اول نذیر احمد کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر صادق نے نذیر احمد کے ناولوں کے جائزے میں ان کے ناولوں کے ماخذ کا بھی ذکر کیا ہے۔ بنات النعش کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک انگلش ناول History of Sand ford and Marton سے ماخوذ ہے۔ اور توبۃ النصوح ڈیفو کے ناول Family instructor Partone سے ماخوذ ہے۔اس باب میں دیگر ناول نگاروں میں سرشار، شرر، مرزا ہادی رسوا،منشی پریم چند کےفن کا بھی جائزہ لیا ہے۔

اٹھارہواں باب اقبال سے متعلق ہے۔ اس باب میں اقبال کے نظریات، فلسفہ خودی،قوم پرستی وغیرہ پر تفصیل سے بحث کیا ہے۔

انیسواں باب اقبال کے ہم عصروں پر مبنی ہے۔ اس میں ظفر علی خان، چکبست، حسرت موہانی وغیرہ کا تعارف اور تجزیہ ملتا ہے۔ اقبال کے عہد میں رہ کر بھی اپنی الگ پہچان برقرارر کھنے میں ان شعراء کامیاب رہے ہیں۔اس کے بارے میں ڈاکٹر صادق کا کہنا ہے کہ:

> "The first four decades of the present century may well be called the age of Iqbal.However, these poets (Iqbal's contemporaries) h a v e something of their own to say, and it is time that they were rescued from oblivion with which they are threatened" (ص:490)

بیسواں باب میں علامہ راشد الخیری اور حسن نظامی کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں کی کتاب اس زمانے میں بہت ہی مقبول ہوئی تھی۔

اکیسواں باب میں جدید شعراء جوش، فراق، حفیظ، اختر شیرانی، فاخر اور رفیق خاور کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس باب میں مندرجہ بالا شعراء کا جائزہ اختصار کے ساتھ لیا ہے۔

بائیسواں باب جدید اردو ادب سے متعلق ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں نئے مغربی نظیات اور خیالات پرانے خیالات پر حاوی ہو گئے۔ اس دور کے ادب موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے قدر مختلف نظر آتے ہیں۔ اس باب میں فیض، ن۔م راشد، سردار جعفری، اختر الایمان، مجاز، جاں نثار اختر اور منیر نیازی جیسی شخصیتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

تیئیسواں باب افسانے سے متعلق ہے۔ افسانے کے موضوع سے متعلق انھوں نے تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ موضوع سے متعلق اس دور کا رجحان جنس اور عریان نگاری کی طرف ہے۔ اس باب میں عصمت چغتائی، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، خدیجہ مستور وغیرہ کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

چوبیسواں باب متفرق نثر کے عنوان سے ہے۔ جس میں تحقیق، تنقید، سوانح عمری اور سفرنامے کی اصناف کو موضوع ٹھہرایا ہے۔ تحقیق و تنقید کے تحت حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، عبدالرحمان بجنوری اور احتشام حسین کا ذکر موجود ہے۔

پچیسواں باب ڈراما پر ہے۔ اس باب میں امانت لکھنوی کے ڈراما اندر سبھا کے علاوہ دوسرے کوئی بھی ڈرامے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اور فن ڈراما نگاری پر مختصر سا تنقیدی جائزہ بھی ملتا ہے۔

چھبیسواں باب صحافت پر ہے۔ اس باب میں اخباروں اور جرائد کا بہت ہی مختصر تعارف کیا ہے۔ جو تشنہ طلب ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں مصنف کہتے ہیں کہ کوئی ادبی تاریخ اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس میں جدید ترین رجحانات کا ذکر موجود ہے۔ اور مزید لکھتے ہیں کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود ادب کے جدید رجحانات سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر صادق کی یہ تاریخ ادب دراصل ایک تنقیدی تاریخ ہے۔ اس میں ادب کی ترقی کی مسلسل کہانی نہیں ملتی ہے۔ ان میں ادبی اصناف کے ضمن میں ادبی ارتقا کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خامی یہ ہے کہ انھوں نے دکنی ادب پر کوئی بحث نہیں چھیڑی ہے۔ اور جدید دور کے ادب میں شاعری پر جو توجہ کی گئی ہے وہ دیگر اصناف کی طرف نہیں ہوئی۔

اس دور کی تاریخوں کا مجموعی جائزہ:

1920ء سے لے کر 1947ء تک کے عرصے کو دیکھا جائے تو اس دور میں بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں، ان میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب کو پہلی اور باقاعدہ ادبی تاریخ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس میں پہلی بار شاعری اور نثر دونوں کا یکساں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب پر ''آب حیات'' کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھنے والی تمام کتابوں کے لیے سکسینہ کی تاریخ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس دور میں لکھی جانے والی تاریخوں میں عموماً تذکرہ نویسی کا اثر باقی ہے۔ یعنی تذکروں کے انداز میں ہر شاعر و ادیب کا علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلے مختصر حالات زندگی اور بعد میں شاعری یا نثر کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں۔ مگر فنی تنقیدی جائزہ نہیں لیا جاتا۔ اس دور کی تمام ادبی تاریخیں ایک حد تک رام بابو سکسینہ اور محمد حسین آزاد کی مرہون منت ہے۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

خلیل الرحمان اعظمی

’’اردو ادب میں ترقی پسند ادبی تحریک‘‘، خلیل الرحمان اعظمی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ انھوں نے رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے لکھا تھا۔اس پر 1957ء میں یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ یہ مقالہ 1972ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔اس موضوع پر اس سے پہلے عزیز احمد کی کتاب ’’ترقی پسند ادب‘‘ اور سردار جعفری کی ’’ترقی پسند ادب‘‘ شائع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے فعال رکن سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔جب ہم خللیل الرحمان اعظمی کی کتاب کا مقابلہ دوسروں کی کتابوں سے کریں گے تو یہ اندازہ ہوگا کہ ہر اعتبار سے یہ مقالہ بہت ہی وقیع ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے تحقیقی اور معروضی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔اور ترقی پسند تحریک کی کلّی حیثیت کو سامنے رکھا ہے۔اس کے لیے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے لے کر اب تک یعنی 1957ء تک کی تمام اہم تحریروں و تصانیف کو اکٹھا کیا ہے اور ان کی روشنی میں اشتراکیت کے نظریے کا عہد بہ عہد ارتقا اور تبدیلیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو بھی نتائج نکالے گئے ہیں ان کی بنیاد و حقائق ، جو دستاویزوں اور تحریروں کے مطالعے سے برآمد ہوتے ہیں اور ان کا ہر جگہ حوالہ دیا گیا ہے۔اس مقالے کا دوسرا حصہ ترقی پسند ادب کا جائزہ ہے۔اس میں تمام اصناف سخن کو سامنے رکھ کر ترقی پسند ادبی تحریروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مصنفین پر لکھتے وقت عام طور پر ان سب کا نام زیر بحث نہیں لایا گیا ہے بلکہ ان

تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے جن پر ترقی پسند تحریک کی اثر پذیری نمایاں ہے۔ تیسرے حصے میں ترقی پسند تنقید کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ترقی پسند ادب کا تصور نہ تو جامد ہے اور نہ تو آج کی پیداوار ہے بلکہ ایک مسلسل و نامیاتی عمل ہے، جو ماضی کی بہترین روایات اور نئے دور کے مطالبات کو ہم آہنگ کر کے ایک زندہ روح کی شکل میں جاری رہتا ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی کے نزدیک عزیز احمد کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' بڑی خوبی سے جدید دور کے حقیقت نگاری اور ترقی پسند ادب کی نظریے کی تشدید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ مقالہ اس زمانے میں لکھا گیا جب تحریک اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی اور اس میں نئے ادیبوں کا ذکر سرسری طور پر آیا ہے۔ دوسری کتاب سردار جعفری کی ہے جو 1951 میں شائع ہوئی ہے، جسے خلیل الرحمان اعظمی یک طرفہ طرز تنقید کی مثال قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مصنف نے اس کی تاریخی مطالعے اور ادبی نشو و نما کے بجائے ترقی پسندی کے اس تصور کو پیش کیا ہے، جس کا پیشتر حصہ ان کے اپنے تصورات پر مبنی ہے۔ اس مقالے کی خوبی یہ ہے کہ خلیل الرحمان اعظمی نے ترقی پسند تحریک کے فکری تضادات اور کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ اس تحریک نے اپنے منشور میں فکر و نظر اور اظہار خیال کی آزادی پر زور دیا تھا، اس کے باوجود سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے ہیئت اور اسلوب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتے رہے، اس نے تحریر کو دو گروہ میں تقسیم کر دیا تھا۔ بعض ترقی پسند قدیم ادبی سرمایے کو سرہی سے مسترد کرتے ہیں، اور بعض اسے قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خلیل الرحمان اعظمی نے اس کتاب میں مستند اور اہم ادبی و تاریخی مواد کو جس سلیقے سے پرکھا جس سلیقے سے اس کا تجزیہ کیا ہے اور جس زاویے نظر سے مختلف شعراء و ادباء پر اظہار خیال کیا ہے، وہ خود ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خلیل الرحمان اعظمی نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''ترقی پسند تحریک نے اپنے پچیس سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمایے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اسے اگر تخلیق ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصہ نارسیدہ اور ناتراشیدہ ہونے کے سبب سے ناقابل التفات پائے گا اور چند مخصوص شعراء کا کلام ہی باقی رہے گا جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے۔'' (ص:109)

خلیل الرحمان اعظمی نے پہلی مرتبہ وسیع زاویہ نظر کے ساتھ ترقی پسند ادبی سرمایے کو کنگالا ہے اور بڑے ہی غیر جانبداری کے ساتھ تحریر کے محرکات اور اس کی رفتار ترقی کا جائزہ بڑے ہی توازن کے ساتھ لیا ہے۔ پہلے حصے میں اس تحریک کے پس منظر میں انیسویں صدی کے ان تمام تحریکات کا تذکرہ کیا ہے جو قومی بیداری کے سبب سامنے آئی تھی۔ اور انگریزی دور اقتدار تصور اور تہذیبی۔۔۔ کی۔ خلیل الرحمان اعظمی نے ''انگارے'' گروہ کو سیاسی اور قومی بیداری کے طور پر پیش کیا، جس نے تحلکہ مچا رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اس تحریک کے اغراض ومقاصد، منشور، اعلان نامہ، خطبات، اجلاس، اس کی تائید اور حمایت میں مختلف ادیبوں کے خیالات اور اس سے مخالفت کرنے والے ادیبوں کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔ اس مقالے کے دوسرے حصے میں ترقی پسند ادبی سرمایے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، طنز ومزاح، تراجم، رپورتاژ، شخصیت نگاری، ڈائری، مکاتیب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ شاعری کے جائزے کو صرف ممتاز ترقی پسند شعراء تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس دور کے اہم نیم انقلابی اور نیم رومانی مزاج رکھنے والے شعراء کو بھی شامل کیا ہے۔ اس باب میں فراق گورکھ پوری، اختر الایمان اور منیر کو بھی شمار کیا ہے۔ اگر چہ یہ شعراء ترقی پسند نہیں تھے۔ ترقی پسند شعراء کے بارے میں خلیل الرحمان اعظمی نے اچھی رائے دی ہے انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس دور کے شعراء ماحول کے وجود کے ضرور قائل ہے لیکن عام طور پر محبوب سے یہ معذرت کی جاتی ہے کہ جنگ آزادی کے اس دور میں اس کے

محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والے زیادہ تر انقلابی سے زیادہ احتجاجی لہجہ اٹھایا ہے۔وہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں۔اسرار الحق مجازؔ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کی ابتدائی نظموں پر جوش اور غزلوں پر عزیز لکھنوی اور فانی اثرات تھے لیکن بہت مجاز نے ایک اسالیب ولہجہ وضع کیا جس میں نہ جوش کی کرختگی ودرشتی تھی نہ عزیز اور فانیؔ کے لہجے کی اضمحلال و واماندگی ہے۔مجاز کی غنائیت میں چشمے کی روانی، شادابی اور غنفوان شباب کی وارفتگی و والہانہ پن ملتا ہے۔ان کے مزاج میں فارسی کا شاعر عرفی کا تیور ہےاور ان زبان کی شیرینی اور روانی حافظ کے تغزل کی یاد دلاتی ہے،جس میں نشاطیہ عنصر اپنے شباب پر ہیں۔''ص:145

فیض کے بارے میں یہ کہا ہے کہ:

''فیض کے اسلوب بیان میں ایک طرف مانوس اور مروج سانچوں سے استفادہ ہے دوسری طرف اس میں کچھ تازہ عناصر انگریزی کی جدید شاعری کی اثر سے داخل کیے گئے ہیں اور ان دونوں عناصر کو فیض نے اس خوبی سے آمیز کیا ہے کہ ان کا ایک مستقل طرز بن گیا۔راشدؔ اور فیض غالباً جدید شاعری میں ذہن کا عنصر داخل کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور ان کی نظمیں فلسفیانہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک فکری سطح رکھتی ہیں۔لیکن فیض اور راشد میں دو حیثیتوں سے نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ایک تو فیضؔ کا اسلوب ہندوستانی شاعری کے لیے بالکل اجنبی نہیں ہے کیوں کہ اس میں قدیم ادب کی بہت سی روایتوں کا زیر وبم سنائی دیتا ہے۔دوسرے فیض کا نقطہ نظر اثباتی ہے اور وہ زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کو انگیز کر کے اس میں ایک صحت مند زاویہ نظر پیدا کر سکتے ہیں۔''(ص:137)

سردار جعفری پر انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ

''سردار جعفری اپنی شاعری کا مواد بی شروع شروع میں اعلان ناموں ہی سے اخذ

کیا۔ان کی نظموں میں وجدان اورتخلیقی عناصر کی کمی شروع ہی سے کھٹکتی رہی ہے۔''

(ص:143)

ساحر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی نظمیں بھی بہت گہرے تجربات وشعور کی حامل نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر دلکشی رکھتی ہیں اور یہی ان کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔'' (ص:152)

خلیل الرحمان اعظمی ان شعراء کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں تخلیقی۔۔

کتاب کا تیسرا حصہ ترقی پسند تنقید، اس میں پائے جانے والے تضادات کو اجاگر کیا ہے۔ یہ خیال عرض کیا ہے کہ ترقی پسند تنقید نے اردو تنقید کو تاثراتی پیرائے بیان سے نکل کر اپنے عہد کے تقاضوں سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بنایا۔تاہم اقبال کے تعلق سے ترقی پسند شعراء کے اظہار خیال بھی پیش کیا ہے۔ترقی پسند ادیبوں نے اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔اقبال کو فاسسزم کا علم بردار ٹھہرایے تھے۔ترقی پسند تحریک کے ارکان ماضی کے سرمایے سے بھی مطمئن نہیں تھے۔سردار جعفری اقبال کے بارے میں یہ خیال کا اظہار کیا ہے کہ

''یہ اقبال کا مستقل تضاد ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جس حسین وجمی دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ان کا فلسفہ اس دنیا کے تباہ کرنے والے افراد کی پیدائش میں مدد دیتا ہے۔اس لیے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ان کی فلسفیانہ شخصیت سے الگ کر کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں اور فلسفی چھوٹے۔اس تضاد کی وجہ سے اقبال کی شاعری کہیں تو انتہائی بلند، حسین اور پر شکوہ ہے کہیں بے انتہا پست۔'' (ص:182)

اس کے برخلاف اقبال کی تعریف کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کے ایک مشہور ناقد سرور کہتے ہیں کہ:

''اقبال کی صرف یہ خوبی نہیں کہ وہ اپنے دور کی خصوصیات کے آئینہ دار ہیں۔ان

کے کلام میں بعض ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو ہر دور میں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ محض سیاسی یا معاشرتی میلانات کی مصوری نہیں کرتے جو ان کے دور میں ابھرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بلکہ وہ انسان، اس کی انسانیت اس کی قدر و قیمت، بندگی اور خدائی، جبر و اختیار، عقل و عشق جیسے مسائل کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں۔ ان کا تخلیق گوئٹے، رومی، شیکسپیئر، ملٹن اور غالب کی ہمنوائی کر سکتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو وہ عارف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور زمان و مکان کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔'' (ص:283)

خلیل الرحمان اعظمی کے نزدیک ترقی پسند ادب کے زیر اثر ادبی تنقید اردو زبان کی ایک فعال اور کارآمد صنف قرار پائی۔ ترقی پسند تحریک سے متعلق یہ ایک بے حد اہم مقالہ ہے اس میں جو ادبی اور تاریخی مواد پیش کیا گیا ہے وہ ہر اعتبار سے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ان تمام تحریروں کو، جو ترقی پسند تحریک سے متعلق ہے، سیاق و سباق کے ساتھ جمع کر کے ایک کامیاب اور مکمل تصویر پیش کی ہے۔

اردو ادب کی مختصر تاریخ ۔از ۔ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ء میں اے ایچ پبلشرز سے شائع ہوئی جب کہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں اسی ادارے سے منظر عام پر آیا۔قیامِ پاکستان کے بعد چھپنے والی تاریخوں میں اس کا چھٹا نمبر ہے۔ اس میں ادب کو اکائی سمجھتے ہوئے نثر و شاعری دونوں کو برابر کا درجہ دیا ہے اور ایک دور یا زمانے میں نثری اور شعری ادب پاروں کا اکھٹا جائزہ لیا ہے جس کی وجہ سے اسے صحیح معنوں میں ادبی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

کتاب کے آغاز ہی میں ''عرض ناشر'' کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تاریخ خاص طور پر ایم۔اے اردو کی نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ۲۲ صفحوں کی طویل فہرست کے بعد ''روبرو'' کے عنوان سے مصنف نے کتاب لکھنے کے مقصد، اہمیت و ضرورت سے آگاہ کیا ہے۔مصنف کے مطابق اس نے ابتداء سے زمانۂ حال تک مختلف اصناف میں ادب کا سلسلہ وارِ منظر نامہ پیش کیا ہے۔ کتاب مختصر رکھنے کی وجہ سے حالاتِ زندگی کی تفصیل کے بجائے ادبی کارناموں اور خصوصیات فن کو اہمیت دی گئی ہے۔ ہم عصر ادباء و شعراء کی شمولیت کا جواز دیتے ہوئے مشنف کا کہنا ہے کہ انہیں مستقبل کے مؤرخ کو معلومات فراہم کرنے کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ یہ احساس کہ معاصر ادب کی کسی تاریخ ادب میں شمولیت تاریخ کا حصہ نہیں بلکہ مستقبل کے مؤرخ کے لیے موار فراہم کرنا ہے، ایک ذمہ دار مؤرخ کی سوچ کا اظہار کرتا ہے۔ کیوں کہ معاصر ادب پر لکھنا بہت ذمہ داری کا کام ہے۔معمولی سی غلطی فوراً نشانہ تنقید بن جاتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے بھی کوشش کی ہے کہ ذمہ داری س درست مواد فراہم کریں۔اس کتاب میں کل تیرہ باب ہیں۔فہرست ابواب کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے انہیں رجحانات،

تحریکوں، اداروں اور اصناف کے حوالے سے تقسیم کیا ہے۔ گوکہ زمانی تسلسل بھی قائم رکھا ہے مگر ہر زمانی دور میں انہوں نے ضمنی تقسیم اسی حوالے سے کی ہے ۔ یوں ایک زمانی دور میں موجود اصناف اور ان کے حوالے سے مشہور افراد کا جائزہ سامنے آجاتا ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''اردو زبان کی ابتدا، پس منظر اور قدیم روایت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں شروع میں تمہید ہے جس میں وہ اردو اور برصغیر پاک و ہند کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر سیاسی و معاشرتی پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اس میں وہ بچپن ہزار سال پرانی تاریخ سے سفر شروع کر کے ۱۹۴۷ء کے دور تک آتے ہیں۔ اس سفر کے درمیاں وہ شاستروں کا ذکر کرتے ہیں۔

''اپنشد ہندو فلسفہ کے اہم ماخذات میں اور انہیں علم و دانش کی تصنیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔ کپل کا سانکو شاستر، پاتنجلی کا یوک شاستر اور ویاس کا اترمیمانسا چند اہم شاستر میں جن کا اطلاق امورِ حیات پر بھی ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد رامائن اور مہابھارت جیسی کتابیں لکھی گئیں۔'' (۲۲۵)

ان معلومات کی تصحیح کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ:

''کپل منی شائلیہ فلسفے کے اہم ستون ہیں۔ سانگو شاعران کی کتاب نہیں ہے۔ اترمیمانسا کا صحیح نام اترمیمانسا ہے۔ یہ رامائن اور مہابھارت پر مقدم نہیں کئی صدی مؤخر ہیں۔'' (۲۲۶)

اس باب میں ڈاکٹر انور سدید اردو رسم الخط کے ضمنی عنوان میں دو ہندوستانی لپیوں یا رسم الخط کے نام بتاتے ہیں۔ ایک پلی برہمی اور دوسری کھروشتی ہے جب کہ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق صحیح لفظ ''کھروشٹھی'' ہے۔ (۲۲۷) یہ باب اپنی جزئیات کے اعتبار سے سکسینہ کی تاریخ کے باب اوّل کا عکس لگتا ہے۔ کیوں کہ مصنف نے انہی کی طرح شاعری کے اصناف کے ساتھ شاعری کے چند متعلقات تخلص اور مشاعرہ کا تعارف کرایا ہے۔ البتہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی

بات کا آغاز ہزاروں سال پہلے سے کیا ہے۔ نیز غیل ملکی زبانوں کے دخیل الفاظ کی تفصیلات نہیں دیں۔ کتاب کا دوسرا باب ''اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء اور بھکتوں کا حصہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر انور سدید نے جو اشعار بابا فرید شکر گنج کے حوالے سے دیے ہیں بعد کی تحقیق نے ان اشعار کو بابا فید کے اشعار نہیں مانے۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید نے بھی ''معراج العاشقین'' کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کرنے کی غلطی دہرائی ہے۔ حالاں کہ اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ تصنیف ان کی نہیں بلکہ بعد کی تحریر ہے۔ تیسرے (۳) باب میں اردو زبان کے پہلے شاعر مسعود سد سلمان کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک ان سے پہلے زمانے کے کسی شاعر کا دیوان دریافت نہیں ہوگا۔ اس اقتباس میں مصنف کا انداز مؤرخ کا سا نہیں ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی مؤرخ بنا ثبوت وشہادت کسی بات کو بیان نہیں کرتا۔ ایک طرف ڈاکٹر انور سدید خود مانتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا دیوان دریافت نہیں ہوا۔ دوسری طرف اس دیوان کو دیکھے بغیر اسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس باب میں پہلی بار نثر بھی شاعری کے ساتھ ملتی ہے۔ جو مختصر ضرور ہے۔ مگر اسی زمانی دور میں موجد ہے۔ اس سے پہلے عموماً شاعری کا ذکر مکمل کرنے کے بعد ہی نثر کا ذکر ہوتا تھا۔ چوتھا (۴) باب اردو ادب کا ابتدائی فروغ'' ہے جس کو پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ابتداء میں مختصر سیاسی پس منظر اور اس کے اثرات کا ذکر ہے۔ اردو کے قدیم دکنی ادب میں بہمنی دور کے ملفوظات اور نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا ذکر ہے۔ اسی بعد بیجا پور کے اہم شعراء وادباء کا ذکر ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی غلطی ہے جو یقیناً سہو کاتب بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ بیجا پور کو بے جا پور لکھا گیا ہے جب کہ اصل لفظ بی جا ہے۔ اردو نثر کے ضمن میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب ''معراج العاشقین''

کا انتساب درست نہیں۔ کیوں کہ انہوں نے اردو زبان میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

پانچواں باب ''شمالی ہند میں اردو ادب کی صبح صادق'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب چھ حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں شمالی ہند میں اردو شاعری کی روایت کا تذکرہ ہے۔ جو ولی دکنی سے شروع ہوئی۔ مختصر تعارف کے ساتھ مختصر نمونۂ کلام سے دیا ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر انور سدید نے شاہ حاتم کا سنہ وفات ۱۷۸۲ء دیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب کی جلد دوم میں یہ سنہ ۱۱۹۷ء/ ۱۷۸۳ء دیا ہے۔'' (۲۲۸)

'درد، سودا اور میر کا عید میں ان شعراء کی شاعری کا پر اثر تجزیہ کیا ہے لیکن اس حصہ میں موجود چند شعراء کے سنہ ولادت اور سنہ وفات میں گڑ بڑ کر گئے۔ مثلاً درد کا سنہ وفات ۱۷۸۴ء لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ۱۷۸۵ء بتاتے ہیں۔ (۲۲۹) اسی طرح میر اثر کا سنہ وفات ۱۸۳۴ء کے لگ بھگ بتاتے ہیں جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے میر اثر کا سنہ ولادت ۳۶۔۱۷۳۵ء اور سنہ وفات ۱۷۹۴ء بتایا ہے۔ (۱۳۰) اس باب میں شاعری سے متعلق آخری حصے میں پورے دور کا مکمل تجزیہ دیا ہے جو بظاہر ایک صفحے پر ہے مگر اس اختصار میں بھی جامعیت کی خوبی موجود ہے۔

اس باب کا اگلا حصہ اردو نثر سے متعلق ہے۔ اس میں مختصر انداز میں ادبی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ جعفر زٹلی سے لے کر فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' تک کا سفر تیزی سے طے کرتے ہوئے اسے مثالوں سے مزّین کیا ہے۔ اسی باب میں غیر مسلموں کا مذہبی ادب میں ڈاکٹر انور نے ڈاکٹر گل کرسٹ کو غلطی سے فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل لکھا ہے۔ حالاں کہ اب یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ شعبہ ہندوستانی کے پروفیسر تھے کالج کے پرنسپل نہیں تھے۔ اس حصے میں اٹھارہویں صدی میں اردو لغت و قواعد نویسی والا حصہ بہت مفید ہے۔ اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں نے بھی اردو زبان کی گرائمر اور لغت میں کافی دلچسپی لی اور مفید کام بھی کیے۔ سب سے آخر میں اردو تذکرے میں تذکرے کی صنف کا تعارف اور معلومات دی ہیں۔

چھٹا باب ''اردو ادب کا نیا مرکز۔۔۔۔۔۔۔لکھنؤ'' کے عنوان سے ہے۔اس میں ابتداء میں مختصر سیاسی منظر اور نئے مرکز کے فروغ کے اسباب بیان کیے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید اس باب میں جرأت کا سنہ وفات ۱۸۱۰ء لکھتے ہیں اور جمیل جالبی تاریخ ادب اردو کی جلد سوم میں جرأت کا سنہ وفات ۱۸۰۹ء لکھتے ہیں۔ (۲۳۱) ڈاکٹر انور کے مطابق آتش کا سنہ وفات ۱۸۴۶ء ہے اور جمیل جالبی ۱۸۴۷ء کو درست سنہ تسلیم کرتے ہیں۔ (۲۳۲) اس باب میں ڈاکٹر انور سدید ریختی، مرثیہ، مثنوی، واسوخت، داستان اور ڈراما کا مختصر مختصر تعارف دیتے ہیں مگر ان کے نماونے نہیں دیتے۔ساتواں باب نظیر اکبر آبادی سے مختص ہے۔رام بابو سکسینہ کے تتبع میں ڈاکٹر انور سدید نے نظیر کا ذکر الگ باب میں کیا ہے البتہ مثالیں چند ایک دی ہیں جس کے باعث رنگِ سخن واضح نہیں ہو پاتا۔

آٹھواں باب ''اردو نثر کے فروغ کے دو ادارے'' کے عنوان سے ہے۔اس میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان سے متعلقہ افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے تعارف کے ضمن میں پچھلے صفحوں والی غلطی کو نہیں دھرایا یعنی کالج کا پرنسپل نہیں لکھا اور اس کا صحیح مرتبہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر لکھا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے دلی کالج کے سلسلے میں پہلے ابتدائی مختصر سی تاریخ بیان کی ہے اور پھر کالج کے نامور لوگوں کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد ان مستشرقین کا مختصر تعارف ہے۔جنہوں نے علم و ادب کے میدان میں بڑے بڑے کام کیے۔اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے انگریز شاعروں کا تعارف اور نمونۂ کلام بھی دیے ہیں۔

نواں باب ''غالب کا عہد'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کے آغاز میں مختصر انداز میں انیسویں صدی کے نصف آخر کی منظر کشی کی ہے اوراس دور کا سیاسی وتہذیبی پس منظر بیان کیا ہے۔اس باب میں مرزا غالب کے تذکرہ وتعارف کو ڈاکٹر انور سدید نے سب سے زیادہ صفحات دیے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے خواجہ منظور حسین کی کتاب ''تحریکِ جدو جہاد بطور موضوع سخن'' کے حوالے سے غالب کی شخصیت کا ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔ جو اس سے پہلے کسی اور تاریخ میں سامنے نہیں آیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق قوت وعمل کا جذبہ غالب نے غزل میں ایمائی انداز میں پیش کیا تو اس کا واقعاتی پس منظر تعمیم میں چھپ گیا اور مستقبل کے نقاد جو اس پس منظر سے واقف نہیں تھے۔انہیں نئے معنی پہنائے لگے۔خواجہ منظور نے غالب کے بعض اشعار کا پس منظر متعین کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کے ہم نوا تھے۔(۲۳۳) یہاں ڈاکٹر انور سدید مؤرخ کا ایک اہم فریضہ پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اچھی ادبی تاریخ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ مطالعہ کے نئے نئے پہلوؤں سے قاری کو روشناس کرائے اور نئی کتابوں کے پڑھنے کی ترغیب دے۔اس باب میں وہ غالب کی ایک نئی شخصیت کو سامنے لا کر اس کے متعلق مزید مطالعہ کی ترغیب دیتے ہیں۔اس کے علاوہ اس باب میں دینی ادب کا بھی تعارف کراتے ہوئے اس سے متعلق تخلیق نگاروں کا جائزہ لیتے ہیں۔اس باب میں نثر کے تذکرے میں صحافت اور تذکروں کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔اس باب کے آخر میں اس دور پر ایک مختصر سا تبصرہ ہے جس میں وہ ۱۸۵۷ء کو زمانی اور تاریخی اعتبار سے اہم قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس دور میں مغلوں کا رسمی اقتدار ختم ہوا۔قدیم اور جدید دور کے درمیان حدِ فاصل جنگِ آزادی کا واقعہ بنا۔ادب کا کلاسیکی وہ ختم ہو جاتا ہے۔تین اصناف منظر عام پر آتی ہیں۔ ڈراما، سفر نامہ اور ڈائری نویسی، اردو میں سنجیدہ اور مدلل تبصرہ اور تنقید کا رواج ہوا۔اس تبصرے

سے ڈاکٹر انور سدید گہری بصیرت کے حامل نقاد نظر آتے ہیں جس کی نظر پورے دور پر ہے۔ وہ مؤرخانہ انداز میں حالات و واقعات کا جائزہ لے کر مختصر انداز میں جامعیت کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

دسواں باب ''سرسید احمد خان کا عہد'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب اٹھارہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہے۔ ۲۳ صفیوں کے اس باب میں سرسید کے عہد میں سامنے آنے والی تمام اصناف کا اجمالاً ذکر اس میں مصنف نے بخوبی کیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں مختصر پس منظر ہے جس میں اس دور کے حالات بیان کیے ہیں اور سرسید کے ساتھ ان کے رفقاء کا ذکر دبستانِ سرسید کے عنوان سے کیا ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں ان افراد کا ذکر ہے جنہوں نے سرسید کے مقاصد اور نصب العین سے اختلاف کیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے بڑے اچھے انداز میں سرسید کے مخالفین کا تذکرہ کیا ہے اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اس سے اگلے حصے میں فروغِ نثر کے چند زاشیے کے عنوان سے نثر کی چند نئی ابھرنے والی اصناف کا تعارف کرایا ہے کیوں کہ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق سرسید کے عید میں احوال و آثار زمانہ پر ردِعمل کا اظہار اردو نثر پر سب سے زیادہ ہو۔ اس ضمن میں ناول، انشائی ادب، سوانحی ادب، خودنوشت، سوانح نگاری، خطوط، سفرنامہ اور تذکروں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ سفر ناموں کے ضمن میں اب تک دستیاب سفرناموں میں حج کے قدیم ترین سفرنامے حاجی منصب علی خاں میرٹھی کے ''ماہِ مغرب'' کے متعلق معلومات دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو کے نئے مرکز لاہوں اور انجمن پنجاب کا تعارف بھی دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور سدید کا تجزیہ بڑا درست ہے کہ بیسویں صدی میں ادبی تجدد کے جو زاویے ابھرے ان میں سے بیشتر کا منبع و ماخذ انجمن پنجاب تھی۔ اردو کے نئے مرکز کو ڈاکٹر انور سدید نے دبستانِ لاہور کا نام دیا ہے۔ عہد سرسید کے

دیگر نثر نگاروں میں ان لوگوں کا ذکر ہے۔ جو دبستانِ سرسید میں شامل نہیں مگر اپنے مقام ومرتبے میں کسی سے کم ہے۔ صغیر بلگرامی کی ''جلوۂ خضر'' اور امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتابیں حالی کی مقدمۂ شعر و شاعری سے پہلے کی تالیف ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی وقعت زیادہ بڑھ جاتی اگر وہ ان کتابوں کے سنہ تالیف لکھ دیتے اور چند ایک اہم مقامات سے اقتباسات بطور نمونہ بھی شامل کر دیتے۔ اسی طرح بیان کے نامکمل ہونے کا احساس باقی نہ رہتا۔ اس باب کے آخر میں پورے عہد سرسید پر تبصرہ ہے جو ڈاکٹر انور سدید پر تبصرہ ہے جو ڈاکٹر انور سدید کی متوازن تنقیدی صلاحیتوں کی عکاسی کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔۔سرسید احمد خان۔۔۔۔۔۔کی تحریک کے اثرات بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بھی نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔عہد سرسید میں اردو ادب نے قدیم سے جدید کی طرف پیش قدمی کی اب عظمتوں کے بازیافت کی گئی اور مستقبل کے بہبود کا خواب دیکھا گیا۔'' (۲۳۴)

گیارہواں باب ''اقبال کا عہد'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مختلف آٹھ حصوں میں اس عہد کی مختلف اصناف اور ان سے متعلق ادباء اور شعراء کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ آغاز میں مختصر سیاسی، عملی و ادبی پس منظر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کے حالات زندگی بہت مختصر دیے اور کلام وفن کے تنقیدی جائزے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے وہ اقبال کی فنی و ادبی ہیبت وعقیدت سے مرعوب نظر نہیں آتے۔ جہاں وہ ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں وہیں اقبال کی نثر کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> ''اقبال نے اردو نثر کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان کے خطوط میں نثر کاروباری نوعیت کی ہے لیکن مضامین میں انہوں نے تہذیبی اور تدریسی لہجہ اختیار

کیا ہے۔سید عبداللہ نے اسے رومانی نثر قرار دیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ مشکل الفاظ کے استعمال نے اسے کھردرا بنا دیا ہے اور اسے رومانی لطافت سے محروم کر دیا ہے۔ چنانچہ اقبال کی نثر اردو زبان کی فطری لطافت کے ساتھ پوری مطابقت نہیں رکھتی۔'' (۲۳۵)

اس اقتباس میں ڈاکٹر انور سدید آزاد فکر نقاد نظر آتے ہیں جو کسی ادبی شخصیت کی بڑائی سے مرعوب نظر نہیں آتے بلکہ اس کے بارے میں اپنی رائے بلا جھجک دیتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں عہد اقبال کی اردو غزل اور اردو نظم کا تنقیدی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اردو نظم کے ساتھ ساتھ میر انیسؔ کے بعد کے مرثیہ گوؤں کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ اس باب کے اگلے حصے میں رومانی نثر کے معمار کے عنوان سے رومانی دور کے نثر نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں ''مختصر افسانہ'' کے ضمنی عنوان کے ضمن میں اردو کے پہلے افسانہ نگار کی بحث کرتے ہوئے پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے شائع شدہ افسانوں کے سنین کا جائزہ لے کر یلدرم کے افسانے ''غربت و وطن ۱۹۰۶ء کو پہلا طبع زاد افسانہ اور سجاد حیدر یلدرم کو پہلا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں جب کہ ڈاکٹر گیان چند ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں راشد الخیری کے افسانے ''نصیر اور خدیجہ'' ۱۹۰۳ء کو پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں۔'' (۲۳۶)

''تنقید ادب نظریہ سازی کا ابتدائی دور'' کے ضمنی عنوان میں تنقید کی صنف کا ادبی پس منظر بیان کرتے ہیں اور اہم نقادوں کی فنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا آزاد سے تحقیق کی جس روایت نے جنم لیا۔ بیسویں صدی میں جن محققوں نے اس کو اپنا خونِ جگر دے کر پالا۔ ان محققین کا ذکر ڈاکٹر انور سدید ''تحقیق کی روایت'' کے ضمنی عنوان کے تحت کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے بعد ڈاکٹر انور سدید کی سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کے ضمن میں اس دور کے نامور سوانح نگاروں کا جائزہ لیتے ہیں۔ عہدِ اقبال میں بہت خطوط نگار سامنے آئے جن

سے ایک روایت قائم ہوگئی۔اس روایت کا مختصر مختصر ذکر ملتا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سفر نامے کی صنف کی سبھی اقسام کا مختصر مختصر جائزہ لیا ہے۔سفر نامے کے بعد ''بیسویں صدی میں ڈراما'' کے ضمنی عنوان میں اسٹیج ڈراما اور ادبی ڈراما نگاروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ صحافت،طنزومزاح،دینی ادب اور ادبی تاریخ نگاری کی اصناف کا ذکر ملتا ہے۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر انور سدید نے پورے دور پر تبصرہ کیا ہے

بارہواں باب ''اردو ادب کی جدید تحریکیں'' کے عنوان سے ہے۔اس میں آغاز یں جدید تحریکوں کے ضمن میں اقبال کی تحریک،رومانی تحریک،ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے احوال و آثار دیے ہیں۔اس کے بعد تنقید کے ضمن میں اس کی مختلف اقسام کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں افسانے کے تحت مختلف اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ان تمام تجزیوں میں ڈاکٹر انور سدید ایسے نقاد کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو کسی بھی موضوع کا بغور جائزہ لے کر اپنی ٹھوس اور حتمی رائے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انور رومانی شعراء کے تذکرے کے ضمن میں جوشؔ کا سنہ وفات ۱۹۸۰ء بتاتے ہیں جب کہ ڈاکٹر ملک حسن اختر جوش کا سنہ وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء بتاتے ہیں۔(۲۳۷)

ترقی پسند شعراء کے ضمن میں جن لوگوں کا تذکرہ دیا ہے۔ان کے سب کے سنین ولادت و وفات کچھ بھی نہیں دیے۔حالاں کہ ایک ادبی تاریخ میں یہی سنین سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اسی باب میں ''شاعری کا جہانِ دیگر'' کے ضمنی عنوان میں ڈاکٹر انور سدید ایسے شعراء کا ذکر کرتے ہیں جن کا فنی رویہ سبھی تحریکوں سے بالکل مختلف ہے۔ان میں مجید امجدؔ،تخت سنگھ،عابد علی عابد،حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ کا ذکر ہے۔تنقید کے تین زاویے میں ڈاکٹر انور سدید رومانی تنقید،ترقی پسند اور نفسیاتی تنقید کے لکھنے والوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی صلاحیتوں کو جانچتے ہیں۔البتہ کسی کے طرز تحریر کا کوئی نمونہ نہیں دیتے جس سے تشنگی کا احساس

ہوتا ہے۔ ''تنقید کا جہانِ دیگر'' میں ڈاکٹر انور سدید ایسے ناقدین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے کسی مخصوص تحریک سے وابستگی کے بجائے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور مشرق و غرب سے حسب ضرورت استفادہ کیا۔ اس باب کے آخر میں ڈاکٹر انور سدید دنیائے افسانہ کے تحت افسانے کی مختلف اقسام اور ان کے لکھنے والوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان میں رومانی، ترقی پسند افسانہ نگاروں کا تعارف کراتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ایک اور گروپ بھی تھا جو نفسیاتی افسانہ نگاری میں دلچسپی دکھتے ہوئے زندگی کو متنوع جہت سے دیکھنے کا انداز رکھتا تھا۔ اس باب کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مصنف نے طرز تحریر اور اسلوب بیان کو سمجھنے کے لیے نمونے نہیں دیے۔ سب کے نہ سہی صرف اہم شعراء و ادباء کے ہی نمونے دے دیے جاتے تو ایک طرف قاری کو جہاں ان کے طرز تحریر سے آگاہی ہوتی وہیں یہ باب اور بھی زیادہ مفید ہو جاتا۔ اس کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس میں سنین سے بے توجہی برتی گئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے صرف چند ایک کے سنہ وفات دیے ہیں۔ مگر سنہ ولادت کیس کی بھی نہیں دی یوں یہ باب مکمل ہوتے ہوئے بھی تشنگی کا احساس رکھتا ہے۔

تیرہویں باب کا عنوان ہے۔ ''آزادی کے بعد ادب کا جدید دور'' اور فٹ نوٹ میں ڈاکٹر انور وضاحت کرتے ہیں کہ: ''۔۔۔۔۔۔ میں نے اس باب کو آزادی کے بعد کا دور جدید شمار کیا ہے اور یہاں لفظ جدید بہ اعتبارِ زماں استعمال کیا گیا ہے۔ (۲۳۸) اس باب کے آغاز میں سیاسی و ادبی پس منظر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ باب قیام پاکستان ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور پر مبنی ہے۔ اس دور کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ اس دور کے تجربے ردّ و قبول کے عمل سے گزر رہے ہیں اور ان پر حتمی رائے دینا مشکل ہے۔ اور انہیں بہ اعتبار صنف تاریخ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے شامل کیا گیا ہے کہ ارتقائی منظر نامہ مرتب ہو اور مستقبل کے مؤرخ کو اپنی

رائے قائم کرنے کے لیے کچھ مواد ملے۔(۲۳۹)اس اقتباس سے مصنف کے باشعور ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ حال کے لمحے پر تنقید آسان کام نہیں، گزرتے وقت کے ساتھ فکر ونظر کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے مؤرخ بالعموم عصرِ حاضر کو اپنی تاریخ کا مُو بنانے کے بجائے چھوڑ دیتے ہیں۔مگر یہاں ڈاکٹر انور سدید نے اس حقیقت کو جاننے کے باجود عصرِ حاضر کو اپنی تاریخ کا حصہ بنایا ہے جو یقیناً ایک جرأت مندانہ قدم ہے۔تمہیں کے بعد اردو شاعری کا جائزہ ہے جس میں بس سے پہلے غزل اور اینٹی غزل یعنی جدید تر غزل کا تعارف وتجزیہ دیا ہے۔ اینٹی غزل کا تعریف کرتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شراء نے تضحیک و استہزا کی صورت پیدا کی اور قدیم راویتِ غزل کو شکستہ کیا۔مگر جلد ہی یہ تضحیکی رجحان ختم ہو گیا۔اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر انور سدید ۱۹۸۶ء تک منظرِ ادب پر طلوع ہونے والے دیگر بہت سے شعراء کے صرف نام گنوائے ہیں جنھوں نے اس دور میں اپنی ادبی شہرت کو قائم کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر پر ان کی گرفت کس قدر مضبوط ہے اور وہ اپنے عہد پر کتنی توجہ رکھتے ہیں۔نظم کے ضمن میں بھی بہت سے نظم کو شعراء کا تعارف ڈاکٹر انور سدید کراتے ہیں۔مگر ان کے نمونہ ہائے کلام پیش نہیں کرتے جس کے سبب تاثر تشنہ رہ جاتا ہے اور شاید ایسا اختصار کی پابندی کے باعث ہوا ہے کہ نمونہ کلام کہیں بھی نہیں دیتے۔ جدید نظم کے علاوہ مصنف نثری نظم کا بھی تعارف کراتے ہیں اور اس تجربے سے متعلق شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں مگر حسبِ روایت یہاں بھی نمونہ کلام کی کمی محسوس ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اردو گیت اور دوہے کہ ذیل میں کئی شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ دہائی صنف کا ادبی پس منظر اور قدیم شعراء کے دوہوں کے نمونے بھی مصنف نے دیے ہیں۔جس سے اس صنف سے آگہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ چند نئی اصنافِ سخن کے ضمنی عنوان میں ہائیکو، ماہیا، ثلاثی/ثلث، کافی، سی حرفی، نظمانہ اور آزاد غزل کا تعارف دینے

کے ساتھ ایک ایک دو دو مثالیں دی ہیں تا کہ یہ اصناف سمجھ میں آسکیں۔ اس کے علاوہ دینی شاعری میں نعت اور مرثیہ کہنے والوں کا مختصر تعارف ہے۔

نثر کی اصناف میں افسانہ، ناول اور ناولٹ لکھنے والے مصنفین کا تذکرہ وتعارف دیا ہے۔ اس باب میں انشائیہ کا تعارف و تذکرہ بھی دیا ہے اور طنز و مزاحیہ ادب کے تحت نثر نگاروں، شاعروں اور کالم نگارں کا تذکرہ بھی دیا ہے۔ مگر نمونوں کی کمی یہاں بھی محسوس ہوتی ہے۔ سفر نامے کی صنف اندرونِ ملک سفر ناموں، حج کے سفر ناموں کے ساتھ ساتھ ادبی سفر ناموں کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ مصنف نے ان سبھی اقسام کے سفر نامہ نگاروں کے تعارف وتذکرہ پیش کیا ہے۔ رپورتاژ کے متعلق مصنف کا کہنا ہے کہ سامنے کی دیکھی ہوئی حقیقت اور صورت واقعہ کو ادبی صورت دے دی جائے تو اس قسم کی رپورٹ کو رپورتاژ کہتے ہیں۔ مصنف کے مطابق رپورتاژ کا فن ارتقاء کے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ اس صنف میں وقت کے قدم کو زمانۂ حال کے نقطے پر قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اس صنف کا نقطۂ معراج ومعیار قرۃ العین حیدر نے قائم کیا اور فی الحال وہی اس کی منتہی نظر آتی ہیں۔ (۲۴۰) اس کے بعد سوانحی ادب اور اس کی اقسام کا تعارف اور لکھنے والوں کا تذکرہ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ''یادنگاروں'' کے عنوان سے ماضی کی یادوں کو مجتمع کر کے لکھنے کے رجحان کو متعارف کرایا ہے۔ ان کے مطابق معنوی طور پر یادنگاری کے نقوشِ فن آپ بیتی کے ساتھ ملے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خاکہ نگاری کی صنف کا مختصر پس منظر بیان کیا ہے اور ان خاکہ نگاروں کا تذکرہ ہے جنہوں نے اس صنف کو طاقت و توانائی فراہم کی۔ مکتوب نگاری کے ضمن میں کئی افراد کے خطوط نویسی کے انداز کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد ڈراما کی صنف کا تذکرہ وتعارف ہے جس میں اسٹیج ڈراما، ادبی ڈرانا، ریڈیو، ٹی وی ڈراما اور منظوم ڈراموں کا تعارف دیا گیا ہے۔ پہلے مختصر ادبی پس منظر ہے اور اس کے بعد

مشاہیرِ ڈراما کا تذکرہ دیا ہے۔

ادبی تحقیق کا موضوع گو پہلے بھی تاریخ ادب کا موضوع بنتا رہا ہے مگر ڈاکٹر انور نے غالباً پہلی بات اس میں ''دبستانِ لاہور'' اور ''دبستانِ کراچی'' کی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ دبستانِ لاہور کے متعلق ڈاکٹر انور لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔۔۔۔تحقیق کے دبستانِ لاہور کی روایت کا رشتہ حافظ محمود شیرانی کی راویت سے بندھا ہوا ہے۔اس دبستان کا طرۂ امتیاز لسانی اور واقعاتی تحقیق میں داخلی اور خارجی شواہد کی بناء پر صداقت کی تلاش ہے۔اس دبستان کے عملی رویے میں ایک مخصوص ضابطۂ اخلاق پر عمر اور مروجہ تاریخ مغالطوں کی صحت شامل ہے۔۔۔۔۔۔اس دبستان نے علوم وفنون اسلامی کی تحقیق،تنقید اور تحسین کا شعور پیدا کیا اور مسلمانوں کی علمی،ادبی،لسانی اور تاریخی ورثے کی دریافت اور تحفّظ میں گہری دلچسپی لی۔'' (۲۴۱)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے صرف کسی ایک جگہ چند لوگوں کے اجتماع کو دبستان سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اس کے لیے چند مخصوص مقاصد اور اصولوں کی پاسداری کو ضروری سمجھا ہے۔دبستانِ کراچی کی خصوصیات کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔دبستانِ کراچی کی تحقیقی روایت کا سرچشمہ مولوی عبدالحق کی تحقیقی روایت سے پھوٹتا ہے۔یہ دبستان تحقیق میں استخراجی اور اشتقاقی طریقوں کو اہمیت دیتا ہے اور متون کی دریافت،تحقیق اور تصحیح میں خصوصی دلچسپی لیتا ہے۔دکنی ادب قدیم شعراء کے تذکروں،پرانی بیاضوں اور نایاب مخطوطوں کی تلاش و دریافت میں بھی دبستانِ کراچی نے خصوصی خدمات سرانجام دی ہیں۔۔۔۔۔۔لسانیات کو بھی اس دبستان نے ایک اہم مبحث کی حیثیت دی اور اس پر قابلِ قدر کام کیا۔۔۔۔۔۔'' (۲۴۲)

تنقید کے حصے میں ڈاکٹر انور سدید نے چار دستانوں کا تعارف کرایا ہے۔سب سے

پہلا کلاسیکی دبستان ہے۔ اس کے بعد دبستانِ حسن عسکری میں شامل ناقدین کا تعارف اور فنی خصوصیات کا بیان ہے۔ ایک منفرد وتنقیدی دبستان کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی نظریات سے متاثر تنقید نگاروں کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند دبستان کے جائزے کے علاوہ قدین کے ایسے گروہ کا بھی تذکرہ ہے کو کسی دبستان میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ناقدین کا بھی تذکرہ ہے جو منفی تنقید کا رنگ رکھتے ہیں جو تنقید کی فضا کو خراب کرتے ہیں ان سب ناقدین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ البتہ ہم عصر ہونے کی بنا پر ان کے مقام و مرتبہ کا تعین نہیں کرتے۔

تنقید کے بعد ''ادبی صحافت'' کا حصہ ہے اس میں ایسے ادبی رسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آزادی کے بعد ادب کی محرک قوت ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان رسائل میں ادب لطیف، سویرا، مخزن، الحمراء، سنگِ میل، جاوید، قند، جریدہ، احساس، افکار، ماہِ نو، نقوش، فنون، سیب، نیا دور، اوراق، صحیفہ وغیرہ کا تعارف کرایا ہے۔ ادبی صحافت سے اگلا حصہ ادبی تاریخ نگاری کا ہے جس کے آغاز میں ادبی تاریخوں میں تین اقسام کا ذکر ڈاکٹر انور سدید کرتے ہیں۔ ایک قسم کئی لوگوں کی مشترکہ محنت والی تاریخوں کی ہے۔ ایک انفرادی کوشش سے ترتیب پانے والی مفصّل تاریخیں ہیں اور تیسری قسم تفصیل کو اجمال میں سمیٹ کر مختصر ترین تاریخوں کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان تینوں قسموں کی مثالیں صفحے کے آخر میں حاشیے میں دی ہیں۔ حالاں کہ یہ معلومات یا مثالیں حاشیے میں دینے کے بجائے متن میں دینا زیادہ بہتر تھا کیوں کہ یہ مثالیں غیر ضروری یا متن کے تسلسل کو خراب کرنے والی نہیں ہیں۔

باب کے آخر میں آزادی کے بعد کے ادب پر عمومی تبصرہ ہے۔ اس میں مختلف اصناف کی اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں جو آزادی کے بعد انہیں درپیش تھیں۔ مگر اس دور

میں پاک و ہند کے ادب پر ڈاکٹر انور سدید نے جو اپنی رائے دی ہے وہ یقینا قابلِ غور ہے۔ یہ رائے جہاں انہیں ایک زیرک تیز فہم نقاد ثابت کرتی ہے وہاں ایک جہاں دیدہ مؤرخ بھی ثابت کرتی ہے جس کی نظر بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ سکتی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''برصغیر پاکستان و ہند میں ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء جو تاریخِ آزاشی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دن کے بعد نہ صرف اردو ادب کے تہذیبی مزاج میں متقدیہ تبدیلی رونما ہونے لگی بلکہ قومی تقاضوں اور عصری حالات نے پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے ادیبوں کے ردِعمل کی نہج، جستجو اور تجزیہ کے محرکات اور اظہار و بیان کے قرینوں میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ پاکستان میں اردو ادب نے قدیم روایت سے اپنا داخلی رشتہ کو قائم رکھا لیکن نئی روایت کی ترتیب میں مکمل خودمختاری سے کام لیا اور نہ صرف حمد، نعت منقبت، انشائیہ، سفرنامہ ہائیکو اور تجریدی و علامتی افسانہ کو فروغ دیا بلکہ اس مقبول عام سیاسی نعرے کی نفی بھی کر دی کہ سیاسی تقسیم ادب پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بلاشبہ اردو زبان کا ادب جو پاکستان اور ہندوستان میں تخلیق ہو رہا ہے۔ اس میں اصنافِ ادب کا اشتراک تو موجود ہے لیکن محرک قوت اور فکر کی لہر یکساں نہیں۔'' (۲۴۳)

ایک جیسے تہذیبی حالات اور ماضی رکھنے والے دو ملکوں کے ادب کے درمیاں فرق کا اتنا واضح اور کھلا احساس کسی اور ادبی تاریخ میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر انور سدید نے پہلی بار بڑے واضح انداز میں اس احساس کو پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تاریخ کا عنوان ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' رکھا ہے۔ مگر اس کی فہرست ہی جو ۲۲ صفحوں پر خاصی تفصیل سے پھیلی ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ''مختصر'' کے لفظ کا محض تکلف ہی کیا ہے۔ یا اسے صحیح معنوں میں کوزے میں دریا کا بند ہونا ہونا کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں ماضی سے لے کر حال کے لمحۂ

موجود تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کا مختصر مختصر تعارف دینے کی کوشش کی گئی ہ۔ ۲۰ صفحے پر پھیلی ہوئی کتابیات سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنف نے کتنے زیادہ مآخذوں سے استفادہ کیا ہے اور ان میں دی گئی معلومات کا بلاواسطہ یا بالواسطہ فائدہ اٹھایا ہے۔ مصنف نے اس تاریخ کو زمانی تسلسل میں رکھ کر متعلقہ دور کی اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ شاعری اور نثر دونوں اس میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید جائزے کے ساتھ ساھت اپنی رائے یا تبصرہ بھی دیتے ہیں جس سے کسی مخصوص دور، واقعہ یا شخصیت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ادب کے تاریخی جائزے میں اس دور کے مروجہ ادب یا اصناف کے رجحان کے مخالف رو کو بھی بیان کرتے ہیں جس سے ادبی منظر نامہ شفاف ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً پانچویں باب میں وہ ایہام گوئی کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس کے ردِ عمل کی تحریک سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ یا مثلاً دسویں باب میں سرسید کے عہد میں سرید سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے ساتھ ساتھ سرسید کے مختلف لوگوں سے بھی تعارف کراتے ہیں۔ اسی طرح تیرھویں باب میں غزل کے تعارف میں اینٹی غزل کی رو کا تعارف اور اردو نظم میں جدید اردو نظر کے خلاف ردِ عمل پر لکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا مؤرخانہ فریضہ پورا ہوجاتا ہے کہ ہر مؤرخ کسی دور کے متعلق لکھے تو اس دور کے سبھی رجحانات کا جائزہ لے کر درست تصویر سامنے لائے۔

اس تاریخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاصر ادب کے بیان سے آنے والے مؤرخ کے لیے نئے سماجی حالات میں نئی تاریخ کے رقم کرنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مواد کی فراہمی کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تاریخ میں اختصار کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس لیے سیاسی سماجی اور ادبی پس منظر کو بہت وضاحت اور تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ البتہ اپنی بات کی تصدیق کے لیے جا بجا

حوالے دے کر شہادت اور سند مہیا کرتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو اپنا بیان ہی دوسرے لوگوں کی باتوں کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی ایک خوبی مصنف کا سادہ شگفتہ اور رواں اسلوب ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا ہے اور معلومات کی فراوانی کو بوجھ بنانے کے بجائے ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذاتی رائے یا تبصرہ اس کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے کام آتا ہے۔ مگر اس ذاتی رائے یا تبصرے کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے کسی کی دل آزادی کرنے یا کسی مسئلہ کو اختلافی بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ صرف مصنف کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے فیصلہ کا حق قاری کو دے دیا جاتا ہے۔

اس تاریخ میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں چند خامیوں بھی ہیں۔ مثلاً اس کی سب سے پہلی خامی اس کا اختصار ہے کیوں کہ کسی کسی مقام پر یہ اختصار بیان کی تفہیم میں رکاوٹ بنتا ہے یا کسی منظر نامہ کو واضح نہیں ہونے دیتا۔ مزید برآں ایک خامی یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے کہیں بھی کسی شاعر و ادیب کا سنہ ولادت نہیں دیا۔ کہیں کہیں کسی شاعر یا ادیب کا سنہ وفات دے دیا ہے۔ اس اہتمام کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں دیگر تاریخوں میں دونوں سنین باقاعدہ سے مل جاتے ہیں۔ شاہد سالِ پیدائش درست دینے کے لیے زیادہ جستجو یا تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے جن کی رحمت فاضل مصنف نے نہیں کی۔

اس کے علاوہ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ معیاری چیزوں کے ساتھ ساتھ غیر معیاری چیزوں کی بھر مار ہے جب کہ مصنف خود ان کے غیر معیاری ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگر اس خامی کو دور کر دیا جائے تو یقیناً بہترین چیزیں سامنے آ کر معیار کے بہتر ہونے کا سبب بنیں گی۔

مختصر یہ کہ یہ تاریخ ادب گو کہ صرف ایم۔اے کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہے۔ مگر اس

میں بیش بہا معلومات موجود ہیں۔ بالخصوص عصرِ حاضر کے ادب سے متعلق معلومات نے اسے
ہت اہم بنا دیا ہے۔ اگر اس کتاب میں موجود خامیوں کو نکال دیا جائے تو واقعتاً یہ ایک مزید اچھی
اور معلومات سے پر تاریخ ہو جائے گا۔

اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک۔ از ڈاکٹر تبسم کاشمیری

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ، ادبی تاریخ نگاری میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ سوچ اور فکر کے نئے احساس نے اس تاریخ کو ایک خوشگوار اضافہ بنا دیا ہے۔ یہ تاریخ ۲۰۰۳ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوئی۔ کتاب کے ''پیشِ لفظ'' میں ڈاکٹر تبسم نے اپنے نظریۂ تاریخ، مؤرخ کے فرائض اور ایک اچھی تاریخ کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق بیسویں صدی انقلابی تبدیلیوں کی صدی ہے جس میں بہت سے پرانے تصورات ختم ہو رہے تھے اور نئے خیالات و تصورات سامنے آ رہے تھے۔ تاریخ اور ادبی تاریخ میں بھی انہوں نے اپنا رنگ دکھایا۔۔۔ ''بیسویں صدی میں تاریخ کے تصورات میں انقلابی تبدیلیاں فرانس کے انلس دبستان (Annales School) سے شروع ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے انلس دبستان کے مؤرخین نے تاریخ کو اس کے محدود تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر علمی معنویت عطا کی۔'' (۳۰۸) اس دبستان کے خیالات سے متاثر ہو کر ڈاکٹر تبسم کہتے ہیں کہ ہمیں ادبی تاریخ کا ایسا تصور وضع کرنا چاہیے جو ادب اور ادب سے متعلقہ علوم کے حوالوں سے ادبی تاریخ کا جائزہ لے۔'' (۳۰۹)

ڈاکٹر تبسم کے مطابق ادبی تاریخ کے مؤرخ کی بصیرت سیاسی سماجی اور واقعاتی تاریخ کے مؤرخ سے زیادہ ہونی چاہیے کیوں کہ ادبی تاریخ کا مؤرخ تاریخ کے تمام

دھاروں اور شعبوں پر بیک وقت نظر ڈالتا آگے بڑھتا ہے۔ ان کے خیال میں ادبی مؤرخ کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ادبی تاریخ کے ارتقائی عمل میں ماضی کے ادبی ذخائر کا جائزہ لے کر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ اس کے لیے اسے ماضی شناس ہونا ضروری ہے۔ اردو ادب کے مؤرخین سے ڈاکٹر تبسم بجا طور پر یہ گلہ کرتے ہیں کہ وہ جوشِ تحقیق میں اس حقیقت کو فراموش کو دیتے ہیں کہ ان کا اصل جام تو ادبی مواد کی تحسین و تفہیم کا ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے کی تاریخوں کا عمومی جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر تبسم کی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ہو یا ڈاکٹر اعجاز حسین کی، عموماً ان میں تصانیف کے حسن و قبح اور روایت میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس طرح دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم پیشِ لفظ میں ادبی تاریخ نگاری کے اصول وضوابط متعین کرتے نظر آتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ ان کی اپنی تاریخ ادب ان کے نظریات اور اصولوں کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔

یہ تاریخ انیس ابواب پر محیط ہے اور سنہ ۱۰۰۰ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے زمانی دور پر پھیلی ہوئی ہے۔ پہلا باب حسبِ روایت، ''زبان کا ابتدائیہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس لسانی صورتِ حال'' کے عنوان سے ہے۔ مولانا آزاد نے ''آبِ حیات'' میں پہلا باب لسانی مسائل پر لکھ کر اس کی باقاعدہ روایت قائم کی کہ ہر تاریخ ادب کا پہلا باب لسانی مسائل و مباحث پر بنی ہو۔ اس کے بعد عموماً ہر تاریخ ادب کا پہلا باب لسانی مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے بھی اسی روایت کو برقرار رکھا ہے اور لسانی مباحث کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی، تاریخی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور اس پس منظر میں زبان میں آنے والی تبدیلیوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ دوسرا باب ''شمالی ہند میں ابتدائی زبان و ادب کا جائزہ۔۔۔۔'' پر مبنی ہے۔ اس باب میں ''خواجہ فرد دے شکر گنج'' کے جلی عنوان کے نیچے ۱۲۶۶ء۔ ۱۱۷۳ء لکھا ہے

اور بابا فرید کا سنہ ولادت کسی ماخذ کی اطلاع دیے بغیر ۵۸۴ھ/ ۱۱۸۸ء دیا ہے۔ اب ان دونوں تاریخوں کا مطلب مفہوم کیا ہے۔ کیا عنوان کے نیچے دی گئی تاریخ اس دور کو ظاہر کرتی ہے جس دور کا تجزیہ کیا گیا ہے؟ یا اسے بابا فرید کا عرصۂ حیات سمجھا جائے یہ بات واضح نہیں ہو پاتی۔ ڈاکٹر گیان چند اپنی تاریخ ادب کی جلد اول میں لکھتے ہیں:

''ان (بابا فرید) جا زمانۂ حیات ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۳ھ/ ۱۲۶۹ ہے۔۔۔۔'' (۳۱۰)

امیر خسروؔ کے تذکرے میں امیر کے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ اس پورے عہد کی تہذیبی تاریخ بھی بیان کی ہے اور امیر کا نفسی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح کبیرؔ کی تاریخ پیدائش ڈاکٹر تبسم نے ۱۴۰۷۔ ۱۴۴۰ء کے درمیاں تحریر کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر کیان چند اپنی تاریخ ادب کے حصہ اول میں بتاتے ہیں کہ کبیر کے محقق ڈاکٹر رام کمار ورما کا اندازہ ہے کہ کبیر کا عرصہ حیات ۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء ہے۔ (۳۱۱)

ڈاکٹر تبسم نوشہ گنج بخش اور ان کی تصنیف ''گنج الاسرار'' کا مختصر متنازعہ تعارف کراتے ہیں اور اصل حقیقت کو تلاش کرنے کے بجائے ان الفاظ میں یہ تذکرہ مکمل کرتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔۔گنج الاسرار جسے ابتداء میں دریافت کیا گیا تھا اور اردو کی ادبی تاریخ میں ایک نئی کڑی قرار دیا گیا تھا۔ اب شکوک وشبہات کے دھندلکوں میں سوالیہ نشان کے طور پر صاف نظر آ رہی ہے۔'' (۳۱۲)

اسی طرح ''بکٹ کہانی'' والے افضل کی اختلافی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے دیگر ناقدین کی آراء کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر خود اس سوالیہ نشان کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ البتہ والہ داغستانی کے تذکرے میں دیے گئے افضل کے حالات سے متفق نظر آتے ہیں مگر اس کی وجہ نہیں بتاتے۔ وہ ''بکٹ کہانی'' کا تفصیلی فنی تجزیہ پیش کرتے ہیں جس میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں بھرپور طریقے سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

باب نمبر ۳ ''گجری ادب'' سے متعلق ہے جس کا زمانی دورانیہ ۱۴۰۷ء تا ۱۵۸۲ء ہے۔اس باب میں ڈاکٹر تبسم شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا سبہ وفات ہجری سنہ میں ۹۸۳ھ تحریر کرتے ہیں جب کہ ڈاکٹر گیان چند اپنی تاریخ کی جلد اوّل میں یہ سن ۹۳۷ھ دیتے ہیں۔(۳۱۳) اپنی اس باب میں ڈاکٹر تبسم مشہور شعراء کے ذکر کے ساتھ ساتھ گجری ادب پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور یہاں مؤرخ و نقاد دونوں صورتیں بیک وقت نظر آتی ہے اور ان کا حسنِ امتزاج نتیجہ کے استخراج میں نظر آتا ہے۔ باب نمبر ۴ کا عنوان ہے ''بہمنی دور کا ادب (۱۵۲۶ء۔۔۔۔۱۳۴۷ء) اس باب میں مصنف سیاسی ولسانی پس منظر بیان کرتے ہوئے بہمنی ادب کے آغاز وارتقاء کی داستان سناتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم اس باب کے آغاز میں جنوبی ہند کی اردوئے قدیم کے آغاز کا حال بیان کرتے ہیں تو یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نقاد شاعرایہ اصطلاح میں سیاسی ولسانی پس منظر بیان کرتا ہے۔مثلاً محمد تغلق کا سفاکانہ اور ظالمانہ شخصیت کے حوالے سے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔اس کی اذیت پسند طبیعت قتل سے کم تر سزا پر اعتنا ہی کرتی تھی۔اس لیے جب برنی یا فرشتہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ''موت'' اس عہد کا استعارہ معلوم ہوتی ہے۔دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام میں ''موت'' کے اس استعارہ نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔'' (۳۱۴)

اس باب میں جن صوفیاء کرام کا ڈاکٹر تبسم نے ذکر کیا ہے ان میں میراں جی شمس العشاق کے تذکرے میں نام کے ساتھ ۱۴۹۸ء اور ۱۴۰۷ء لکھا ہے۔مگر کسی قسم کی صراحت نہیں کہ ان سنین کا تعلق سنہ پیدائش اور وفات سے کیا ہے۔کیوں کہ میراں جی شمس العشاق کا سنہ ولادت ڈاکٹر گیان چند کے مطابق ۹۰۲ھ ہے۔جو بمطابق ۱۴۹۶ء ہے۔اس لحاظ سے ۱۴۰۷ء سے کیا طلب ہے واضح نہیں ہوتا۔ڈاکٹر تبسم جیسے محقق سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

پانچواں باب ''بیجاپور: عادل شاہی دور کا ادب (۱۶۸۶ء۔۔۔۔۔۔۱۴۸۹ء)
کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر تبسم نے عادل شاہی دور کے شعراء ارادباء کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں وہ مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' کے شاعر مقیمیؔ کے تذکرے میں اس کا سنہ ولادت ۱۶۰۶۔ ۱۶۰۱ء کے درمیاں اور سنہ وفات ۱۶۷۰۔ ۱۶۱۵ء کے درمیاں بتاتے ہیں جب کہ ڈاکٹر گیان چند اور سیّدہ جعفر کی مشتر کے تالیف ''تاریخ اردو ادب ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد دوم کے ساتویں باب میں سیدہ جعفر نے بیجاپور ہی کے ایک دوسرے شاعر ''مرزا مقیم'' کا سنہ ولادت وہی لکھا ہے جو مقیمی کا سنہ ولادت ڈاکٹر نے لکھا ہے۔ قدیم دکنی ادب سے متعلق تاریخوں میں عموماً یہ غلطی دہرائی جاتی ہے کہ مرزا مقیم اور حقیمی دونوں کو ایک ہی شخص سمجھا جاتا ہے جب کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا اس سلسلہ میں کہا ہے کہ:

''۔۔۔۔۔مرزا مقیم اور مقیمی دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ مقیم ایرانی نژاد شاعر تھا اور فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔''　　(۳۱۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی بھی مختلف شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''مرزا مقیمؔ اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں۔ اوّل اذکر بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا جس نے قلعۂ ابکھیری کی فتح کے موقع پر ''فتح نامہ'' مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور مقیمیؔ ''چندر بدن ومہیار'' کا مصنف ہے جس نے کم از کم ایک فارسی مثنوی ضرور لکھی ہے اور دونوں مثنویوں میں اپنا تخلص مقیمیؔ کی استعمال کیا ہے۔ مقیمیؔ کسی بادشاہ کا متوسّل نہیں تھا چندر بدن ومہیار میں کسی بادشاہ کی مدح میں کوئی شعر نہیں ملتا۔۔۔۔۔'' (۳۱۶) ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ میں بھی مرزا مقیم کا سنہ ولادت ۱۶۰۶ء۔۔۔۔۔۱۶۰۱ء کے درمیاں اور سنہ وفات ۱۶۶۹ء۔۔۔۔۔ ۱۶۶۴ء کے درمیاں

بتایا گیا ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر تبسم نے مقیمیؔ کے حوالے سے جو سنہ ولادت اور سنہ وفات لکھا ہے وہ درست نہیں ہے وہ مقیمیؔ نہیں بلکہ مرزا مقیم سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر تبسم عموماً صرف عیسوی سنہ دیتے ہیں حالاں کہ قدیم کتابوں اور مخطوطوں میں ہجری سنہ ملتے ہیں صرف عیسوی سنہ سے کسی سنہ کی تصدیق خاصی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس باب میں جابجا سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور لسانی پس منظر ملتے ہیں جس سے اس دور کی واضح تصاویر سامنے آتی ہے۔

چھٹا باب گولکنڈہ کا ''ادب قطب شاہی دور ۱۶۸۷ء۔۔۔۔۔۔۔۱۵۱۸ء'' پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر تبسم قطب شاہی ادبی روایت کے ذکر کو سیاسی پس منظر کے حوالے سے گھلا ملا کر ایک کہانی کے انداز میں بیان کرتے ہیں اور (۱۷۰) ایک سوستر سالہ دور کو اس خوبصورت طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ تاریخ کا منظر نامہ متحرک ہو کر سامنے سے گزرنے لگتا ہے۔ اپنے بیانات میں کہیں کہیں ڈاکٹر تبسم ایسا تبصرہ کرتے ہیں جسے کلیدی تنقیدی اصول یا نکتہ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی مدد سے کسی خاص دور کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً اسی باب میں میاں جی حسن خدا نما اور میراں یعقوب کے تذکرے میں ''اسلوب'' کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''۔۔۔۔۔۔۔اسلوب کسی شخصیت کا اظہار ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اسلوب کسی عہد کا اظہار بھی ہے۔ ہیت و ساخت میں مختلف اجزائے ترکیبی جیسے لفظ، تراکیب، استعارے اور محاورے مل کر اس اسلوب کی کلّیت کو مترتب کرتے ہیں اور اسلوب کی اس کلّیت جو چیز بہت اہم ہے وہ بدلتا ہوا لسانی شعور ت ہے۔'' (۳۱۷)

اگرچہ اس نکتے کی مدد سے ڈاکٹر تبسم میراں جی خدا نما اور میراں یعقوب کے اسالیب اور اندازِ بیان کی وضاحت کرتے ہیں مگر یہ نکتہ کسی دور کے اسلوب و انداز کو سمجھنے میں کام آ سکتا ہے۔ اس باب میں قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۱۲۰ھ/ ۱۶۱۲ء لکھا ہے۔ اس میں عیسوی

سنہ تو درست ہے مگر ہجری سنہ ۱۱۲۰ھ نہیں بلکہ ۱۰۲۰ھ ہے۔ یہ سہو کتابت ہو سکتا ہے۔ مصنف نے اس دور کے تمام اہم شراء کا تعارف کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ خصوصیات کا اس طرح تنقیدی تجزیہ کرتے ہیں کہ سبھی چھپی ہوئی خوبیاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور قاری سے مزید مطالعے کا تقاضا کرتی ہیں۔

باب نمبر ۷ کا عنوان ہے ''ولی: مرکز جو روایت کا ثمر'' اس باب میں ولی اور سراج اورنگ آبادی کا تذکرہ ہے۔ اس میں ولی کی درست اور حتمی تاریخ وفات کا تعین نہیں کیا گیا۔ البتہ دونوں شعراء کا تنقیدی تجزیہ کر کے جہاں ان کی خوبیوں کو ظاہر کیا ہے۔ وہیں اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا خوصورت استعمال کیا ہے۔

آٹھواں (۸) باب شمالی ہندوستان سے متعلق ہے۔ اس باب کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصے میں سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل کی سیاسی کشمکش کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور زوال مغلیہ سلطنت کا خاصی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ جعفر زٹلی (۱۷۱۳ء۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۵۳ء) کے عنوان سے ہے۔ جعفر زٹلی وہ شاعر ہے جسے پرانے اردو حلقوں نے ہزل گو سمجھ کر نظر انداز کیا۔ ڈاکٹر تبسم اس حصے میں ان کوششوں کا بیان کرتے ہیں جو جعفر زٹلی کی فنی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے لیے گئیں۔ یہ بیانات اس سلسلے میں اہم بھی ہیں اور ڈاکٹر تبسم کی مورخانہ صلاحیتوں کو واضح بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ۱۹۲۷ء میں حافظ محمود شیرانی نے پہلی بات ''پنجاب میں اردو'' میں جعفری کی فنی شخصیت کی تحسین کی۔ اس کے بعد جعفر کے کلام وفن پہ تنقیدی اور تحسینی مضامین منظر عام پر آتے رہے اور بقول ڈاکٹر گیان چند، جعفر زٹلی پہ پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا گیا۔ ڈاکٹر تبسم نے اس نوعیت کی تاریخی معلومات پیش کر کے جہاں ایک طرف جعفر زٹلی کی اہمیت کو آشکار کیا ہے۔ وہیں

اس سے تاریخی معلومات کے حصول میں دلچسپی بھی واضح ہوتی ہے۔

باب نمبر ۹ کا عنوان ہے ''شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات۔۔۔۔۔'' اس باب میں ولی کے دیوان کے دلی میں آمد کے بعد کے اثرات، ایہام گو شعراء کا تذکرہ، ایہام گوئی کے خلاف ردِّعمل اور دلی میں باقاعدہ ادبی شعری روایت کی ابتداء کا تذکرہ ملتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم نے صفحہ نمبر ۲۷۸ پر مرزا مظہر کا سنہ ولادت ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۱ء دیا ہے اور سنہ وفات ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء دیا ہے مگر اس کا ماخذ نہیں بتایا جب کہ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب اردو جلد دوم میں مرزا کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء اور سنہ وفات میں عیسوی سنہ ۱۷۸۱ء دیا ہے۔ (۳۱۸) اسی طرح ڈاکٹر تبسم نے شاکر ناجی کا سنہ وفات ۱۷۳۹ء سے ۱۷۴۵ء کے درمیاں دیا ہے جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ سنہ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۵۷ء دیا ہے۔ (۳۱۹) اس باب میں وہ ایسے نقاد کی صورت نظر آتے ہیں جو بڑے بڑے ناموں سے مرغوب ہوئے بغیر بے لاگ تنقید کرتا ہے۔

باب نمبر دس (۱۰) ''ادبی روایت کا استحکام، عہد ساز شعراء کا دور۔۔۔۔۔۔''
اس باب کے آغاز میں مختصر سا سیاسی اور ادبی پس منظر ملتا ہے۔ پھر سودا درد اور میر تقی میر کی زندگی کے حالات اور کلام وفن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

گیارہویں باب کا عنوان ہے ''دبستانِ لکھنؤ: سیاسی تہذیبی اور ادبی تشکیل'' اس باب میں مصنف نے خاصی وضاحت سے پس منظر بیان کیا ہے۔ نواب شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک کے سیاسی حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے جو حد درجہ عبرتناک ہیں۔ اس باب کا دوسرا حصہ تہذیب کے متعلق ہے جس میں لکھنوی تہذیب کے تشکیلی عناصر کا تفصیلی جائزہ لے کر اس تہذیب کا رنگ واضح کیا ہے جو لطافت، نفاست، حسنِ اخلاق اور بلند تر معاشرت کا نادر

نمونہ تھی۔ وہ اس تہذیب کے عناصر کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کا نفسیاتی تنقیدی تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں جس سے اس تہذیب کا باطن زیادہ واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اس باب کا تیسری حصہ ادب سے متعلق ہے۔ لکھنوی ادب کے اہم عناصر کا تجزیہ و تعارف اس میں پیش کیا گیا ہے۔

ناب نمبر (۱۲) ''ادبی روایت کی توسیع'' لکھنؤ ایک نیا ادبی مرکز'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر تبسم نے میر حسن کا سنہ ولادت ۱۷۴۱ء دیا ہے جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب میں میر حسن کا سنہ ولادت ۱۱۴۹ھ/ ۷۔۱۷۳۶ء دیا ہے۔ (۳۲۰)

ڈاکٹر تبسم مصحفی کا سنہ ولادت ۱۷۴۸ء لکھتے ہیں جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی مصحفی کا سنہ ولادت ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء بتاتے ہیں۔'' (۳۲۱) اس باب میں ڈاکٹر تبسم ایسے نقاد کی صورت نظر آتے ہیں جس کی نظر اپنے موضوع کے ہر پہلو پر بڑی گہری ہوتی ہے۔ یہ صورت میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کے تنقیدی جائزے میں نظر آتی ہے جہاں وہ مثنوی کے واقعات و کرادر کا تعلق اس دور کے معاشرے اور اس کے افراد سے جڑتا ہوا دکھاتے ہیں۔ میر حسن کی سحر البیان کا ایسا تفصیلی تجزیہ یقینا آج تک نہیں ہوا۔

تیرہواں باب (۱۳) باب انیسویں صدی کے دو مشہور اداروں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی خدمات کے جائزے پر مبنی ہے۔ اس باب کے آغاز میں ڈاکٹر تبسم نے مختصر مگر موثر انداز میں اٹھارہویں صدی کے آخری دور کی سیاسی صورت حال کو بیان کیا ہے اور اس کے پس منظر میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ارادے اور مقاصد کو بہت اچھی طرح سے واضح کیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے ڈاکٹر فخر الحق نوری کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے جس میں وہ ڈاکٹر تبسم کا طریقۂ کار کی تحسین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔۔اردو ادب کی تاریخ معلوماتی ہی نہیں، تجزیاتی بھی ہے۔ اس میں عام تصور تحقیق کو عملی جامہ پہنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تنقید کو بطی یساں طور پر

اہمیت دی گئی ہے۔ دراصل تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ اور ادبی تحقیق کے عام اور عامیانہ تصورات سے بلند ہو کر اپنی تصنیف میں تحقیق و تنقید کا امتزاج پیدا کر دیا ہے۔" (۳۲۲)

ڈاکٹر فخر الحق نوری کے ان خیالات کی جھلک دلی کالج کے تعارف میں ملتی ہے جس میں ڈاکٹر تبسم رقمطراز ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ولزلی (Wellesley) کے زمانے (۱۸۰۵ء۔۔۔۔۔۱۷۹۸ء) میں اس مقصد کے لیے جستجو کی جانے لگی کہ حاکموں کے اندر محکموں کو سمجھنے کی بہتر صلاحیتیں پیدا کی جائیں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج اسی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔۔۔۔۔۔۱۸۰۳ء میں دلی اور آگرہ پر قبضہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی شمالی ہندوستان کے مرکز پر قابض ہوگئی تھی۔۔۔۔۔۔اب وہ وقت آگیا تھا جب برطانوی حکام کی معاونت کے واسطے ماتحت عملے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۸۲۵ء میں دلی شہر کے اندر ایسا کالج قائم کیا گیا جو اس قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ یہ دلی کالج تھا۔ دلی کالج کے بارے میں اس قسم کی آراء سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ دلی کالج صرف ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروباری ذہنیت اور نوآبادیاتی کردار کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی راتیخ میں ایسا کبھی بھی ممکن نہ ہو سکا کہ اس نے محض ہندوستان کے مفاد میں کوئی تدبیر کی ہو۔ ہندوستان کو جب بھی کوئی فائدہ حاصل ہوا تو وہ براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر ہوا۔" (۳۲۳)

دلی کالج پر ڈاکٹر تبسم نے خاصا کم لکھا ہے۔ اس کالج کے مشاہیر کا تعارف بھی نہیں۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج کے منشیوں اور پنڈتوں کا تعارف بھی اس باب میں نہیں ہے۔

چودھواں (۱۴) باب "داستانی ادب کا ظہور" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں

میرامن کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرفر کی ''فسانۂ عجائب'' سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے دونوں داستانوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر کی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان میں موجود تہذیبی مرقعے بھی قاری کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کے اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ ان کی تنقید سے اصل کتاب کے مطالعے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے دونوں داستانوں کے تنقیدی تجزیے سے ان داستانوں کے پڑھنے کو دل کرتا ہے۔

پندرہواں (۱۵) باب ''نظیر اکبر آبادی'' سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے پہلی بار نظیر اکبر آبادی کو اپنی تاریخ ادب میں ایک منفرد و مستند شاعر کی حیثیت سے الگ باب عطا کیا تھا۔ اس کے بعد یہ ایک روایت ہی بن گئی کہ بعد میں تاریخ ادب لکھنے والے مؤرخین نظیر اکبر آبادی کا ذکر اپنی تاریخ ادب میں کسی نہ کسی انداز میں ضرور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم نے بھی اسی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ایک باب علیحدہ سے نظیر کے تذکرے کے لیے مختص کیا ہے اور اسے اردو ادب کی تاریخ کا غیر رسمی شاعر کہا ہے جس کی شاعری آگرہ کے ہندو مسلم ثقافت کے امتزاجی رویوں سے اپنی منفرد شناخت کے ساتھ ظاہر ہوئی تھی۔

سولھواں (۱۶) باب ''لکھنؤ کی نھی شمعیں'' کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے اس باب میں ہر شاعر کے تذکرے میں اس کے دور کا سیاسی تہذیبی رنگ واضح کرنے کے ساتھ اس شاعر کے اپنے نفسی رنگ کو بھی واضح کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کا ہر پہلو کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کے نزدیک کسی قصہ، کہانی یا فن پارے میں موجود مرکزی چیزیں یا اہم کردار علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ ان علامتی حیثیتوں کو واضح کرتے ہوئے وہ نئ

معنویت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً گلزارنسیم میں۔۔۔۔۔۔۔ ''بکاؤلی اس دنیا سے آگے دوسری دنیا کی علامت ہے۔ وہ عقل وفہم اور طاقت سے ماوراء ایک ایسی علامت ہے ہو سینکڑوں پردوں میں پوشیدہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ بکاؤلی روشنی کی علامت ہے۔ اس کا پھول روشنی کی علامت ہے۔ اس کا پھول ازسرِ نو بینائی بحال کتا ہے۔'' (۳۲۴)

ڈاکٹر تبسم کے مطابق ''سحرالبیان'' اور ''گلزارِ نسیم'' اپنے اپنے مزاج کے اعتبار سے دو مختلف مثنویاں ہیں۔ ان کا تقابلی جائزہ عجیب سا لگتا ہے۔ مگر ہمارے نقادوں دونوں مثنویوں کا تقابلی جائزہ ضرور لیتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقت ضرور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم ان دونوں مثنویوں کے مزاج کے اختلاف کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیگر تاریخوں میں واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کی اندرسبھا کا الگ الگ عنوانات کے تحت تعارف کرایا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر تبسم نے ان دونوں ڈراموں کا اکٹھا تعارف کرایا ہے جس سے صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی دور کی پیداوار ہیں اور یہ بھی کہ امانتؔ کی اندرسبھا پر واجد علی شاہ کے رہسوں کا بھی خاصا اثر ہے۔

سترہواں (۱۷) باب ''کمپنی کی علمداری'' سیاسی حکمتِ عملی اور مغلوں کے علامتی اقتدار کا خاتمہ (۱۸۵۷ء۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۰۳ء) کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مغلیہ حکومت کے زوال کا پس منظر اور زوال کی داستان وضاحت سے خاصے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ تلخ حقائق کے بیان کا رواں اور دلچسپ اسلوب جو قاری کی توجہ کو کھینچے، ایک اچھے مؤرخ کی بہترین خصوصیت ہے اور ڈاکٹر تبسم اس خصوصیت سے پر نظر آتے ہے۔

اٹھارہویں (۱۸) باب کا عنوان ہے۔ ''دلی کی بزمِ آخر'' ہے۔ اس ضمن میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، شاہ نصیر وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ غالبؔ کا تذکرہ سب سے زیادہ طویل بھرپور

اور جامع ہے۔ یہ انسٹھ (۵۹) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں نثر اور شاعری دونوں کا ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور غالب کی علامتوں اور اشعاروں سے اس کی تحلیل نفسی کرتے ہیں اور ان علامتوں اور اشعاروں کی وضاحت کے بعد غالب کو سمجھنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

کتاب کا انیسویں (۱۹) باب ''مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا مظہر'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ڈاکٹر تبسم نے مرثیے کی صنف اور لکھنوی ثقافت کی مطابقت سے بحث کی ہے۔ لکھنوی معاشرت میں مرثیے کے کیا ترقی کی، مرثیہ نگاروں اور مجالس عزاداری کی کیا صورتِ حال تھی مختلف کتابوں کے حوالوں سے ان معلومات کو بیان کیا ہے۔ یہ آخری باب کچھ عجلت میں لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ مرثیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد کا تعارف نہیں کرایا گیا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیر کا تعارف بھی بہت مختصر ہے اور نمونۂ کلام بھی نہیں البتہ لکھنوی معاشرت و تہذیب میں مرثیے کی صنف اور انیس و دبیر کا مقام تھا اس سے بحث کی گئی ہے۔ نمونۂ کلام کی عدم موجودگی سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

عمومی جائزہ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''تاریخ ادب اردو۔ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' اپنی نوعیت کی نسبتاً مختلف کتاب ہے۔ اس میں روایتی تواریخ ادب کا رنگ بہت کم ہے۔ گو کہ ابواب بندروایتی تواریخ جیسی رہی ہے مگر ان ابواب کے بیان کا انداز بہت مختلف ہے جس سے مصنف کا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے جس کے مطابق ایک اچھی ادبی تاریخ میں واقعات وحقائق کے بیان سے ایک قدم آگے آ کر ایک وژن (Vision) تشکیل پاتا نظر آتا ہے اور اس میں بکھرا ہوا، نے رابطہ،

غیر مرتب مواد کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر کے کسی عہد کو با معنی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مصنف نے عہد کے صرف نمائندہ اور اہم شعراء و ادباء کا تعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر تبسم اپنی اسی تاریخ میں مختصر انداز میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر کرتے ہیں بلکہ ہر عہد کی ادبیات کا جائزہ اسی حوالے لیتے ہیں۔ نیز کسی دور کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ادبی لسانی پس منظر بیان کرتے ہوئے اس دور کی اہم اور نمائندہ تصانیف کا جائزہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری کے مطابق:

''۔۔۔۔۔۔۔تبسم کاشمیری ایک وسیع المطالعہ مؤرخ ہیں اور ادبی تغیرات کی تفہیم وتحسین کے مرحلے مختلف النوع علوم وفنون کو بروئے کار لا کر یک رُخے اور ایک سطحی نہیں۔ بلکہ کئی جہتوں اور متعدد سطحوں کے آئینہ دار ہیں۔'' (۳۲۵)

ڈاکٹر تبسم کی اس تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے زمانی تسلسل کو مختلف ادوار کی اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ ایک خاصل ترتیب و تنظیم اس کی خالہ بندی میں موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر فخر الحق نوری:

''۔۔۔۔۔۔۔اردو ادب کی تاریخ'' کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ یہ آغاز سے انجام تک خاص منصوبہ بندی Planning کے تحت اردو ادب کی تاریخ کے طور پر ہی قلمبندی کی گئی ہے۔تبسم کاشمیری نے باقاعدہ سوچ بچار کر کے متوازن کڑیوں سے اردو ادب کی تاریخ کا سلسلہ تشکیل دیا ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ کا کوئی حصہ بھی مضامین کا مجموعہ محسوس نہیں ہوتا۔'' (۲۳۶)

ڈاکٹر تبسم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شاعر یا اس کے فن پارے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کے متعلق تفصیل سے یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ وہ کب منظرِ عام پر آیا۔ کس محقق کی تلاش و کوشش نے اسے قارئین تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ تنقید اور تاریخ ادب میں اس کا

کیا مقام ہے۔ علاوہ ازیں وہ سیاسی، تہذیبی، ادبی روایات اور تبدیلیوں کے اثرات کو اس جائزے میں اس طرح گھلا ملا کر پیش کرتے ہیں کہ سب یکجان محسوس ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم ادبی نظریات و رجحانات کے ساتھ ساتھ لسانی اثرات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور بدلتے ہوئے ادوار میں ان کی تبدیلیوں کو واضح کرتے جاتے ہیں۔ نیز کسی شاعر یا ادیب کا حقیقی مرتبہ متعین کرتے ہوئے اس کے متعلق پہلے سے موجود معلومات اور آراء کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ذاتی رائے بھی دیتے ہیں جو کافی ٹھوس اور جاندار ہوتی ہے کہ قاری ان کے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کی یہ تاریخ مکمل تاریخ نہیں ہے۔ آغاز سے ۱۸۵۷ء تک کی قدیم دور کی تاریخ اور ادبی تاریخی سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ ابھی موجودہ عہد تک کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کی نظرِ کرم کی منتظر ہے اور اس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد یہ تاریخ مکمل ہو کر ایک وقیع تاریخ ادب کی صورت میں اختیار کرے گی۔ تا حال یہ جلد اپنی جگہ پر مکمل اور بہترین تاریخ ہے۔

حوالہ

1. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، تمہید
2. اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:28
3. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:12
4. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:20
5. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:27
6. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:45
7. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:76
8. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:81
9. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:92
10. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ ص:124
11. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی پیش
12. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، دیباچہ
13. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:2
14. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:8
15. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی ص:12
16. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:44
17. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:46
18. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:52
19. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:55
20. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:58
21. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:58
22. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:61
23. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:63
24. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:84
25. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:91
26. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:95
27. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:101
28. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:121
29. تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، ص:456
30. A history of urdu literature,T Graham Bailey,p:60
31. تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ
32. T Graham Bailey,p: 92 ,history of urdu literature
33. A history of urdu literature, T Graham Bailey,p:101
34. A history of urdu literature, T Graham Bailey,p:103
35. A history of urdu literature, T Graham bailey p:121
36. تاریخ نظم ونثر، آغا محمد باقر ص:34
37. آغا محمد باقر، تاریخ نظم ونثر، ص:165
38. مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، ص:6
39. داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، ص:23
40. A History of Urdu literature, M. Sadiq,Preface,XIII

اردو کی منتخب ضخیم ادبی تواریخ: تحقیقی وتنقیدی جائزہ

علی گڑھ تاریخ ادب اردو

علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد 1962ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک ضخیم منصوبے کا حصہ تھی، جو بہت سی وجوہ کی بنا پر مکمل نہ ہوسکا۔اوراس پہلی جلد بھی علماءوادباء کے تندو تیز احتجاج کی وجہ سے مارکیٹ سے واپس لے لی گئی۔

تاریخ ادب کے اس حصّے میں کل سات باب ہیں۔جن میں 1600ء سے لے کر 1700ءتک کی ادبی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔کتاب کے آغاز میں پروفیسرآل احمد سرور کی تحریر کردہ تمہید ہے۔جس میں وہ تاریخ ادب کی مکمل منصوبے کی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ان کے مطابق 1955ء میں شعبہ اردوعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو“کی سکیم تیار کی۔سات سال کے اس طویل عرصے کے بعد 1962ء میں اس کی تین جلدیں اور پھر 1964ء میں آخری جلد شائع ہو جائے گی اور یوں ایک جامع تاریخ 5 جلدوں میں چھپ کر سامنے آجائے گی۔ان میں پہلی جلد 1600ء سے 1700ءتک اور دوسری جلد 1700ء سے 1800ءتک، تیسری جلد 1800ء سے 1857ءتک، چوتھی جلد 1857ء سے 1914ءتک اور پانچویں جلد 1914ء سے حال تک کے ادب کے جائزے پر مبنی تھی۔آل احمد سرور کے مطابق ان جلدوں کی ترتیب و تدوین میں دبستانوں کی تقسیم اور علاقائی پاسداری کوغیر ضروری سمجھ کر صدیوں کو پیمانہ بنایا گیا ہے یا پھر تاریخی واقعات سے مواد کی حد بندی کی گئی ہے۔تمہید ہی میں آل احمد سرورادبی تاریخ کا تصور، اس کی تعریف اوراس کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ تمہیدی تحریر خاصی اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے۔

تمہیدی تحریر کے بعد"لسانی مقدمہ" ہے جو انچاس صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس طویل مضمون میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بڑے جامع انداز میں زبان، اس کی بنیادی خصوصیات اور اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ یہ باب خاصا معلوماتی ہے اور اپنے دور تک کی معلومات کے حساب سے مفید ہے۔ زبان دہلوی کا ارتقا کے ضمنی عنوان میں مصنف نے ایک اچھے محقق اور نقاد کی طرح امیر خسرو کی ہندی شاعری کے تنقیدی جائزے میں بحث کے بعد فیصلہ دیا ہے کہ امیر کے ہندی کلام کو قدامت کی سند بخشتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کم از کم اس سے ہرگز اس عہد کی زبان کے متعلق کلیات قائم نہیں کیے جا سکتے۔

وہ اسی مضمون میں" بکٹ کہانی" کے شاعر کا نام مولانا افضل اور ان کا سنہ وفات 1625ء دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب اردو کی ادبی تاریخیں میں واضح کرتے ہیں کہ

> بکٹ کہانی کا شاعر وہ مولانا افضل نہیں جس کا ذکر والہ داغستانی نے اپنے تذکرے" ریاض الشعرا" میں کیا ہے اور یہ سنہ وفات انہیں مولانا افضل کا ہے بکٹ کہانی کے افضل کا نہیں ہے۔"(1)

ڈاکٹر مسعود پنڈت دتاتریہ کیفی کے حوالے سے چندر بھان کی غزل کو اردو کی پہلی غزل کے طور پر تحریر کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ پنڈت جی نے یہ حوالہ نہیں دیا کہ یہ غزل انھیں کہاں سے ملی اور کن وجوہ کی بنا پر وہ اسے اردو کی پہلی غزل تصور کرتے ہیں۔ یہ اعتراض فٹ نوٹ میں کرنے کے بجائے اگر وہ متن میں رکھتے اور اس حوالے سے اس غزل کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو یقیناً اس تحریر کی افادیت بڑھ جاتی۔ اس تحریر میں جسے باب کا درجہ دینا چاہیے تھا زبان و قواعد کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

اس تحریر کے بعد پہلا باب بعنوان" سیاسی اور تمدنی پس منظر" پروفیسر محمد حبیب کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں بڑی تفصیل سے مسلمانوں کی آمد سے لے کر مغل حکومت کے زوال تک

کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔مگر یہ باب صرف سیاسی حالات کے بیان پر مبنی ہے۔ان حالات کا اثر زبان وادب پر کیا پڑااس بارے میں کچھ صراحت نہیں ملتی۔

دوسرا باب" گجرات میں اردو عہد ولی سے پہلے" کے عنوان سے ہے۔اسے پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے۔اس باب میں سیاسی پس منظر کے ساتھ ساتھ لسانی پس منظر بھی دیا گیا ہے۔ گجرات کی لسانی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے مصنف بتاتے ہیں کہ گجراتی شاعر عبد الولی عزلت نے سب سے پہلے اردو نثر میں اپنے دیوان کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔اس باب میں مصنف نے گجرات کے چند اہم شعراء کا تعارف و تذکرہ بھی دیا ہے اور ان شعرا کے رنگ سخن کو واضح کرنے کے لئے نمونہ ہائے کلام بھی پیش کئے ہیں۔

تیسرا باب" اردو ادب بہمنی دور میں" عبدالقادر سروری کا تحریر کردہ ہے۔اس باب میں مصنف نے ابتدا میں دکن کا تاریخی پس منظر دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان ادوار یا زمانوں میں زبان کی جو کیفیات تھیں ان کا بھی تذکرہ کیا گیا جس کی بنا پر یہ حصہ خاصا معلوماتی اور مفید ہو جاتا ہے۔اس میں سروری نے سید یوسف حسینی المعروف شاہ روجو قتال کی وفات کے مختلف سنین دیے ہیں مگر درست سنہ کا تعین نہیں کیا۔اسی طرح سروری نے اردو زبان کی دو تصانیف شاہ راجو سے منسوب کی ہیں۔ایک مثنوی" سہاگن نامہ" اور دوسری" رسالہ شاہ راجو" ڈاکٹر گیان چند ان کا تجزیہ کرتے ہوئے دیگر محققین کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ" سہاگن نامہ" کی صاف زبان کو دیکھتے ہوئے یقین ہے کہ یہ شاہ راجو اول کی تصنیف نہیں بلکہ شاہ راجو ثانی کی ہے۔

سروری نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پر خاصا مفصل لکھا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔سروری صاحب نے خواجہ گیسو دراز کی کئی تصانیف کا وضاحت سے تعارف دیا ہے اور ساتھ ہی ان سے متعلق اختلافی تبصرے بھی تحریر کئے ہیں۔مگر

اس باب کے بارے میں گیان چند لکھتے ہیں:

بعد کی تحقیق نے سروری صاحب کے فرمودات کے بیشتر حصوں کو غلط محض قرار دے دیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقی اعتبار سے علی گڑھ تاریخ میں یہ باب سب سے زیادہ غیر معتبر اور غیر مفید ہے۔اس کے کسی بیان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"(2)

چوتھے باب کا عنوان ہے" اردو ادب عادل شاہی دور میں" یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے۔اس کا پہلا حصہ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھی ہے جبکہ دوسرا حصہ نصیرالدین ہاشمی نے تحریر کیا ہے۔ڈاکٹر نذیر احمد نے مختصر سیاسی پس منظر اور اس دور کی لسانی صورت حال کو کافی وضاحت سے بیان کیا ہے۔انھوں نے جن مشاہیر ادب کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں چند ایک غلطیاں ہیں مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد نے اشرف بیابانی کی نظم "نوسر ہار" کا سنہ تصنیف 1524ء لکھا ہے۔جبکہ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی تاریخ ادب میں "نوسر ہار" کا سنہ 1503ء درج کیا ہے۔

چوتھے باب کا دوسرا حصہ نصیرالدین ہاشمی کا تحریر کردہ ہے۔اس میں انھوں نے اس دور کے چند اہم اور غیر اہم شعرا کا تذکرہ اور ان کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔پھر مرثیہ نگاری اور نثر کا مختصر جائزہ ہے اور باب کے آخر میں پورے دور کے مجموعی شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے مرزا مقیم اور مقیمی مصنف" چندر بدن و مہیار" کو ایک ہی شخص ظاہر کیا ہے۔جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب کی جلد اول میں ایک بحث کے بعد یہ فیصلہ دیتے ہیں:

مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں۔اول الذکر بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا جس نے قلعہ اکبری کی فتح کے موقع پر فتح نامہ مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور مقیمی" چندر بدن و مہیار" کا مصنف ہے جس نے کم از کم ایک فارسی مثنوی لکھی ہے اور دونوں مثنویوں میں

اپنا تخلص مقیمی ہی استعمال کیا ہے۔ مقیمی کسی بادشاہ کا متوسل نہیں تھا۔ چندر بدن ومہیار میں کسی بادشاہ کی مدح میں کوئی شعر نہیں ملتا۔"(3)

پانچواں باب" اردو قطب شاہی دور میں" پر مبنی ہے۔ یہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحریر ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں دکن کے سیاسی پس منظر پر مختصر طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اور اس دور کے اردو ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آغاز میں عہد قطب شاہ کے مشہور شعرا کا تعارف دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تیلگو شاعری کا ترجمہ اور چند نظموں کے تراجم دیے ہیں۔ اس باب میں ملا خیالی فیروز اور محمود کا مختصر تذکرہ و تعارف بھی پیش کیا ہے۔ ملا خیالی کا ذکر اس کی تعمیر کردہ مسجد کے حوالے سے لکھا ہے۔ مگر اس کی شاعری پہ کچھ نہیں لکھا۔ فیروز کا ذاتی تعارف نہیں دیا البتہ پھولبن کے تنقیدی جائزے کے ساتھ ساتھ اس دور کی لسانی خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے قلی قطب شاہ کا ذکر خاصا مفصل کیا ہے۔ اس کے دور حکومت کے بیان کے ساتھ اس کے کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ البتہ کلام کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔

قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ جیسے شعرا کا مختصر تعارف اس باب میں پیش کیا ہے۔ آخر میں مرثیے کی صنف کا بیان اور گولکنڈہ کی تباہی و بربادی اور ادبی بساط کے لپٹنے کا تذکرہ ہے۔ اس باب کے بہت سے سنین درست نہیں ہیں۔ مگر کئی جگہوں پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اغلاط کاتب کی طرف سے ہوئی ہیں۔ اس باب میں کافی نمونہ ہائے کلام دیے گئے ہیں جس سے اس دور کے لسانی رجحانات، سوچنے کے انداز اور فکر و خیال کا بھی پتہ چلتا ہے۔

چھٹا باب" ولی اور اس کا عہد" دونوں نے مل کر لکھا ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین اور سخاوت مرزا اس باب کے مصنفین ہیں۔ اس مقالے میں کہیں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ اس مقالے کی

تصنیف کی تقسیم کس طرح کی گئی ہے۔کس مصنف نے کون سا اور کتنا حصہ لکھا ہے۔اس مقالے میں ولی کا سنہ وفات 1707ء بتایا ہے۔جبکہ جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب میں دلائل کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ ولی کا سنہ وفات 1720ء ہے۔اس مقالے میں ولی کی شخصیت اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔نیز ولی کی زبان کے حوالے سے اس دور کی لسانی خصوصیات کو موضوع بحث بنایا ہے۔اس کے علاوہ ان کے معاصرین میں سے اشرف گجراتی،سراج اورنگ آبادی، ہاشمی بیجاپوری،امین گجراتی، بحری،خروشی اور عبدالولی غزلت کا بھی مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔

ساتویں اور آخری باب کا عنوان ہے"شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے 1700ء تک"۔اس باب کے مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ہیں۔آغاز میں مختصر طور پر اس عہد کے سیاسی پس منظر پیش کیا ہے۔اس کے بعد صوفیا کے اقوال کا تذکرہ اور پھر 1700ء تک کے مختلف شعرا کا احوال دیا گیا ہے۔اس باب میں مصنف نے بابا فرید شکر گنج کے حوالے سے دو غزلوں کے کچھ اشعار دیے ہیں۔بعد کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ دونوں غزلیں بابا فرید سے غلط طور پر منسوب کی گئی ہیں۔یہ ان کے کافی عرصے بعد لکھی گئی غزل ہیں۔

اسی طرح اس مقالے میں بکٹ کہانی کے شاعر کا نام محمد افضل سکنہ جھنجھانہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اپنی تاریخ میں یہ کہتا ہے کہ بکٹ کہانی کا مصنف ہندو ہے۔اس کا اصل نام گوپال اور تخلص افضلؔ ہے۔اس باب میں پیش کردہ معلومات اور سنین اپنے دور تک یقینا درست سمجھے جاتے ہوں گے۔مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معلومات کے اضافے کی وجہ سے آج یہ معلومات درست نہیں سمجھی جاتی ہے۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو ایک بڑا منصوبہ تھا جس میں پانچ جلدیں تیار ہونی تھیں۔مگر اس کی پہلی جلد ہی بڑی تاخیر سے منظر عام پر آئی۔اس تاریخ پر رشید حسن خان کا سخت

تنقیدی تبصرہ شائع ہوا۔جس میں اس تاریخ کے تسامحات کی گرفت کی گئی تھی جس کی بنا پر اس کی پہلی جلد کو بازار سے واپس کرنی پڑی۔اس جلد کی تدوین میں نومختلف اصحاب نے حصہ لیا۔اور سبھی محققین نے اپنے اپنے ذرائع سے بہترین فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔مگران محققین کا آپس میں ربط نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ایک مربوط تاریخ سے زیادہ مختلف مضامین کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔کوئی تاریخ ادب مشترکہ طور پر مصنفین کے ایک جماعت سے لکھوانے کی صورت میں ضروری ہے کہ ان کا آپس میں ربط بھی رہے۔سنین اور واقعات کے بیان میں خاص طور پر ایک دورے کے ذرائع سے آگاہ رہنے سے آپس کے بنیادی اختلافات باقی نہیں رہتے اور اس مشترکہ تصنیف میں وحدت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔مگر اس تاریخ میں اس خاص اصول کا خیال نہیں رکھا گیا جس کے باعث اس میں وحدت کا تاثر اور دلچسپی کا عنصر باقی نہیں رہتا۔

تاریخ ادب کا اچھا اور برا تاثر قائم کرنے میں اس کی طباعت کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ خراب طباعت اور الفاظ یا سنین میں غلطیاں درآئیں تو انھیں عام طور پر لوگ مصنف کی غلطی سمجھتی ہے۔اس لیے چھپائی کے مرحلے کی خاص طور پر نگرانی نہیں کی تو اچھے سے اچھے کام بھی فضول ہو جائیں گے۔اس تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ صحیح طور پر نہیں کی ہے۔اسی خامی کی وجہ سے یہ کتاب معیار سے گر گئی ہے۔

رشید حسن خان اور گیان چند جین نے اس کا تفصیلی جائزہ کیا ہے۔رشید حسن خان نے سخت اور طنزیہ انداز میں اس کی خامیوں کو ظاہر کیا ہے۔اور اس کی خوبیوں کو نظر انداز کیا ہے۔اگر اس کی خامیوں کو دور کر کے پھر سے چھپوادی تو اردو کی ادبی تاریخ نگاری کا ایک اہم حصہ ہو جاتا۔

تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی

ادبی تاریخ پر لکھی گئی کتابوں میں تحقیقی معیار اور مواد کے اعتبار سے یہ صف اول پر ہے۔ مصنف کے مطابق یہ ایک ضخیم منصوبہ ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کی پہلی جلد آغاز سے لے کر 1750ء تک کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ جلد دوم اٹھارہویں صدی کے ادب پر مبنی ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جلد سوم انیسویں صدی کے نصف اول کے جائزے پر مبنی ہے۔ چوتھی جلد انیسویں صدی کے نصف آخر کے شعراء وادباء پر مبنی ہے۔

جلد اول میں قدیم دور کے ادب سے متعلق بحث کیا گیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں تاریخ ادب کے اس سلسلہ کے لکھنے کا مقصد اور اہمیت پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ادب کی تاریخ کی تعریف واہمیت کو جالبی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ادب کی تاریخ ایک ایسی اکائی ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ خود جدید ادب کو دسمجھنے کے لیے قدیم ادب کا سمجھنا ضروری ہے۔ ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس زبان کو بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی، تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات ورجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ میں نے اسی شعور اور نقطہ نظر سے قدیم ادب کا مطالعہ کیا ہے۔" (4)

مندرجہ بالا اقتباس سے جمیل جالبی کا نظریہ ادب واضح ہوتا ہے۔ پیش لفظ میں مصنف نے جلد اول کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق

> اس جلد کا خاکہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ ساری تصنیف کو ترتیب زمانی سے چھ فصلوں

> میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں۔ ہر فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی و لسانی خصوصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کے سامنے اس دور کی واضح تصویر آجائے"۔ (5)

اس تاریخ کا آغاز اٹھارہ صفحوں پر مشتمل تمہید سے ہوتا ہے جس میں اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس حصے میں جمیل جالبی ایک لسانی مورخ کی حیثیت سے پیش آتے ہیں۔ فصل اول شمالی ہند سے متعلق ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلا باب"مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک ہے۔ یہ باب مصنف کی سخت محنت کا ثبوت دیتا ہے۔ اس میں مصنف نے زبان کی سیال حالت کی مثالیں دے کر اس کی شکل وصورت کو واضح کیا ہے۔ دوسرا باب" بابر سے شاہ جہاں تک ہے۔ اس باب میں شمالی ہند کی طویل نظم بکٹ کہانی کا لسانی مطالعہ اس دور کی زبان کی ساخت اور اس نظم کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے۔ اس باب کے آخر میں اس دور پر دی گئی مصنف کی رائے بے حد اہم ہے۔

> اس زبان کے نمونوں کا مقابلہ اگر دکنی دور کے ادب پاروں سے کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ شمال کی زبان زیادہ صاف اور نکھری ستھری ہے۔ ان ادبی نمونوں کی حیثیت ان بکھرے ہوئے رنگارنگ موتیوں کی سی ہے جو اپنی اپنی جگہ بیش بہا ہیں۔ لیکن کسی ایسے بندہ مولا صفات کے انتظار میں ہیں جو ان موتیوں کو پرو کر خوبصورت ہار بنا سکے۔(6)

تیسرا باب" دور اورنگ زیب ہے۔ سیاسی پس منظر کی جھلکیاں ادبی انداز میں نظر آتی ہیں اور مورخ ایک کہنہ مشق ادیب کی صورت نظر آتا ہے جو اپنی تاثیر انشا پردازی کا رنگ جماتا نظر آتا ہے۔ اس فصل میں 1707ء سے 1750ء تک کے شمالی ہند کے زبان وادب کا جائزہ

لیا گیا ہے۔ مصنف نے بڑے اچھے انداز میں شمالی ہند کی ابتدائی دور کی زبان و ادب کی لسانی و فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی، سیاسی اور ادبی صورت حال بھی واضح کی ہے اور عہد گزشتہ کے ان ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت بھی متعین ہو جاتی ہے۔

فصل دوم" گجری ادب اور اس کی روایت ہے۔ اس فصل میں چار باب ہیں، جن میں اس دور کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے جو شمالی ہند کے اس دور کے متوازی ہے۔ اس سے متحدہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں ایک مخصوص زمانی دور میں موجود مشترک ادبی روایت کے تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اس فصل کے پہلے باب میں پانچویں صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری (1050ء–1400ء) کی لسانی اور ادبی روایت کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس باب میں بھی ان سیاسی، لسانی، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کی جھلکیاں ملتی ہیں جو لسانی روایت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس فصل کا دوسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات لغات اور کتبے ہے۔ ڈاکٹر جالبی مختلف بزرگوں کے ملفوظات پیش کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

> زبان ابھی سیال حالت میں ہے اور اس میں علاقائی اثرات تیزی سے جذب ہو کر اظہار کی قوت کو سہارا دے رہے ہیں۔ ان ملفوظات میں بیک وقت مختلف رنگ، مختلف اثرات اور مختلف لہجے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ہر اس فقرے کو ہندوی کا نام دیا جا رہا ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ ملا جلا کر بولے جا رہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرائیکی، گجراتی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں اور ان سب کو ملا جلا کر ایک کرنے کے عمل سے ایک ایسا رنگ ابھر رہا ہے جو بادشاہوں سے لے کر فقیروں تک، صوفیا سے لے کر عوام تک مقبول ہے۔(7)

تیسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کی (1400ء تا 1600ء) ادبی روایت ہے۔

اس باب کا ابتدائی حصہ قاری کو نئی معلومات فراہم کرتے ہوئے اس مفروضے کو ختم کرتا ہے کہ اردو صرف فاسی کے زیر اثر پروان چڑھی۔ ان کے مطابق اردو شاعری پر پہلا اور گہرا اثر ہندوی روایت اور اسطور کا پڑتا ہے اور جب اس روایت کو برتتے کئی صدیاں گزر گئیں تو تخلیقی پیاس بجھانے کے لیے فارسی زبان و ادب کی طرف توجہ کی گئی۔ اس باب میں جالبی بڑی وضاحت سے بتاتے ہیں کہ کس طرح گجرات کے صوفیا نے ہندوی یا اردو کو اظہار خیال کی زبان بنایا۔ اس ضمن میں وہ صوفیانہ شعری کلام سے نمونے دے کر ان پر اپنا تنقیدی تبصرہ پیش کرتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت بھی معین کرتے ہیں۔ ایک ادبی مورخ کا یہی فرض ہوتا ہے کہ وہ عہد گذشتہ کے فن پاروں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو عہد جدید کے لوگوں پر واضح کرے اور ڈاکٹر جالبی اس فریضے کو بڑے اچھے انداز سے پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں ادب پر سیاسی حالات کا اثر کس طرح پڑتا ہے، اس کی وضاحت بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

> سلطنت گجرات کے زوال اور اکبر کی فتح گجرات بعد نئے سیاسی حالات کے سورج نے گجری اردو کی روشنی کو ماند کر دیا اور فارسی اثرات نے خود اردو زبان و ادب کے مزاج میں وہ شگوفے کھلائے کہ رفتہ رفتہ ادب کا معیار اور فکر و خیال کا مرکز نقطہ فارسی زبان و ادب بن گیا۔(8)

چوتھا باب دسویں گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری میں (1600ء تا 1707ء) اردو روایت ہے۔ یہ باب تیسرے باب کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس باب میں بھی ایک ہی تسلسل سے سیاسی تہذیبی اور ادبی پس منظر کی داستان ملتی ہے۔ اس میں بھی ان صدیوں میں موجود شعرا کا تعارف اور نمونہ کلام دیے گئے ہیں اور اس سارے دور کا خلاصہ ڈاکٹر جالبی ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> نویں اور دسویں ہجری میں گجرات کی تخلیقی ہوائیں سرزمین دکن کو تازہ دم کرتی ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری میں کدن کے مینارہ ادب نے نور اور روشنی پھیلا کر
گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں اور بارہویں صدی کے پچیس تیس سال تک
شمال کو راستہ دکھایا۔"(9)

چوتھے باب میں گجری روایت کی داستان کھل ہو جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو فصل دوم کو اتنے ابواب میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک یا دو باب بنالینا زیادہ بہتر تھا۔

فصل سوم کا عنوان" اردو بہمنی دور میں 1350ء سے 1525ء" ہے۔ اس فصل کے صرف دو باب ہیں۔ پہلا باب پس منظر، ماخذ اور خصوصیات پر مبنی ہے۔ اس باب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں خاصی تفصیل سے سیاسی اور تہذیبی حالات کے بیان کے ساتھ زبان وادب پر ان کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ دوسرے زبان کی ساخت، گرامر، املا وغیرہ کا تفصیلی بیان زبان کی شکل کو واضح کرتا ہے۔ دوسرا باب ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل تک محدود ہے۔ اس باب میں مصنف نے نظامی سے لے کر اشرف تک کے دور کے زبان وادب کا جائزہ لیا ہے۔ مختصر ادبی پس منظر کے ساتھ ادبی پس منظر اور اصناف کا بیان بھی ہے۔ اس باب میں لسانی تجزیے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کی تعمیر و تشکیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا باب" گجری روایت کی توسیع، ہندوی روایت کا عروج" ہے۔ اس باب میں سو سالہ مدت میں جو تین خاص رجحانات ابھرتے ہیں۔ ان کا ذکر مصنف نے اس طرح کیا ہے۔

اس دور میں تین رجحانات قابل ذکر ہیں: ایک تو ہندوی روایت جس کے نمائندے
جانم اور جگت گرہ ہیں۔ دوسرے رجحان کے نمائندے عبدل اور شہباز حسینی قادری
ہیں جن کی تحریروں میں بنیادی روایت تو ہندوی ہے لیکن ساتھ ساتھ فارسی اثرات
بھی دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرا رجحان خالص فارسی اثرات کا ہے جو غزل کی شکل میں
ابھر رہا ہے اور جس کی نمائندگی خواجہ دہدار فانی کر رہے ہیں۔"(10)

اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی تفصیل کے ساتھ ان تینوں رجحانات کے حامل شعرا ءاور ادبا کا لسانی اور تنقیدی جائزہ پیش کر کے اپنی علمیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

تیسرا باب" ہندوی اور فارسی روایت کی کشمکش" ہے۔ بطور مصنف اس دور کے اردو ادب کا بنیادی مزاج فارسی سے لبریز ہے۔ جو اوزان، اصناف، رمزیات و اسالیب کی صورت میں بڑھتا نظر آتا ہے۔ اس باب میں جہاں وہ اس عہد کی اہم نگارشات کا تعارف کراتے ہیں وہیں ان کی اسلوبیاتی خصوصیات اور تہذیبی اثرات وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لسانیاتی سطح پر اثرات کا جائزہ لے کر ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ چوتھا باب فارسی روایت کا رواج ہے۔ اس میں مصنف اس دور کی اہم تصانیف ملک خشود کی مثنوی" جنت سنگار"، غزل اور ہارون نامی گھوڑے کی ہجو سے مثالیں پیش کرتے ہوئے اس دور کی فارسی روایت کے اثرات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امین کی مثنوی" خاور نامہ" اور صنعتی کی نظم" قصہ بے نظیر" کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ پانچواں باب" غزل کی روایت کا سراغ کے عنوان سے ہے۔ اس باب کا موضوع نظام شاہی سلطنت کا کہنہ مشق شاعر حسن شوقی ہے جو نظام شاہی سلطنت کے اختتام کے بعد اپنی آخری عمر میں عادل شاہی سلطنت میں پناہ لینے چلا آیا یہ حسن شوقی جو ایک مثنوی نگار اور غزل گو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، فنی تجزیے سے نئی روایات کا حامل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن شوقی کی نظم" فتح نامہ نظام شاہ" کے طویل تجزیے میں اس عہد کے سیاسی و تہذیبی حالات کا مختصر بیان بھی کیا ہے اور ساتھ ہی بھرپور فنی تجزیے کے ساتھ اس کی لسانی فنی خوبیاں اور خصوصیات بیان کی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس کی غزلوں کا فنی جائزہ پیش کر کے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ چھٹا باب" مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں برہان الدین جانم کے دو مریدوں شیخ داول اور شیخ محمود خوش دہان اور

ان کے بیٹے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کی تصانیف نظم ونثر کا فنی جائزہ لیا ہے اور ادب کی روایت میں ان کے مقام اور مرتبے کا تعین کیا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق مذہبی رسالے، ملفوظات و اقوال وغیرہ ادبی تصانیف کے باقاعدہ آغاز کے بعد ان کی اہمیت کم ہو کر صرف تاریخی رہ گئی۔ البتہ صرف ایسی مذہبی تصانیف اہمیت کی حامل ہیں جن میں ادبی شان نمایاں تھی۔ ساتویں باب" دکنی ادب کا عروج پر مبنی ہے۔ اس باب میں شاہی اور نصرتی کی شاعری کا فنی جائزہ لیا گیا ہے اور اس حوالے سے سیاسی منظر نامہ کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس دور کے بارے میں جمیل جالبی کا تجزیہ یوں ہیں:

> نصرتی کی زبان معیاری دکنی تھی جس کے اظہار و بیان کا ایک نیا معیار خود نصرتی نے قائم کیا تھا۔ اگر دکن کی یہ سلطنتیں قائم رہتیں اور دکنی اردو کا یہ روپ قائم رہتا تو آج بھی نصرتی قدیم دور کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی زبان دکنی ادب کی روایت پر غالب آ گئی اور تیزی سے سارے بر عظیم میں پھیل کر ادبی اظہار کا واحد معیار بن گئی۔ اس ستم ظریفی نے نصرتی کو چھوٹا اور ولی کو بڑا بنا دیا۔ تہذیب کے سانچے بدلنے کے ساتھ جب اسلوب بدلتے ہیں تو عظمتیں کس طرح مٹ کر اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔ نصرتی تاریخ کی اسی سفا کی کی مثال ہے۔"(11)

آٹھواں باب نیا عبوری دور کے عنوان سے ہے۔ یہ دور وہ ہے جب شمالی ہند کے سیاسی، تہذیبی، لسانی اثرات دکن پر چھا رہے تھے اور دکنی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ اس باب میں مصنف نے ہاشمی، ایاغی اور مرزا بیجاپوری کے کلام کا فنی جائزہ لے کر اس کلام کی فنی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اس فصل کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دو صفحے میں جن میں مختصر انداز میں عادل شاہی دور کے خاتمے اور بیجاپور کے ادب پر مغلوں مغلوں کی زبان وادب کے اثر کا ذکر ملتا ہے۔

یوں آٹھ ابواب پر مشتمل یہ بیانات یہیں پر ختم ہوتی ہے۔

فصل پنجم"قطب شاہی دور" سے متعلق ہے۔اس فصل کے سات باب ہیں جن میں اس دور کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا باب حسب سابق" پس منظر، روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات سے متعلق ہے۔اس میں جالبی سیاسی ،تہذیبی اور ادبی پس منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ گولکنڈہ اور بیجاپور کا لسانی اور ادبی تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان ہے۔" فاسی رواایت کا آغاز"۔اس میں وہ محمود، فیروز خیالی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی خوبیاں اس طرح واضح کرتے ہیں کہ قدامت کے باوجود ان کے کلام کی خوبی اور اثر و اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔جالبی ان قدیم شعراء کی اہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> یہ بات یقینی ہے کہ فیروز،محمود نے ایک نیم پختہ ادھ کچری ادبی زبان میں فارسی زبان کا رس گول کرجس روایت کوجنم دیا اس نے گول کنڈہ میں بالخصوص اردو شاعری کے اسلوب کا رخ ہمیشہ کے لیے موڑ دیا۔ فیروز اور محمود کے زبان وبیان بعد کے آنے والے شعراء سے بھی زیادہ صاف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اس زبان کے مزاج و معیار کو فارسی زبان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔(12)

تیسرا باب" فارسی روایت کا رواج" ہے۔اس میں فارسی کے رواج کے اکتیس سالہ دور کا جائزہ لیا ہے۔قلی قطب شاہ کے کلام کے فنی تجزیے میں نظر آنے والے نقاد کو اس فنی تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان مثنویوں میں یہ دوراہے ایسے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ جہاں قدیم ہندوی اسلوب ڈوبتا ہوا اور جدید فارسی اسلوب ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چوتھا باب" فارسی روایت کا عروج نظم ونثر میں" ہے۔اس باب میں ملا وجہی کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے فارسی روایت میں اس کا مقام ومرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جالبی وجہی کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے" دیوان

وجہی (فارسی)، مثنوی قطب مشتری اور نثری داستان "سب رس" کے ساتھ ساتھ وجہی سے منسوب ایک اور تصنیف "تاج الحقائق" کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ان کے خیال میں وجہی کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے مصنف کا نام وہ وجہہ الدین محمد بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق یہ تصنیف وجہی کا ہی ہے۔ اسی طرح وجہی کی قطب مشتری کے بارے میں جمیل جالبی یہ لکھتے ہیں کہ اس میں بیان کردہ عشقیہ داستان قلی قطب شاہ اور بھاگ متی سے متعلق ہے۔ لیکن سیدہ جعفر اپنی تاریخ ادب میں اس بات کا صاف انکار کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کہانی قطب شاہ اور بھاگ متی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

مثنوی قطب مشتری کے پلاٹ کی وضاحت کرتے ہوئے سیدہ جعفر نے تاریخ ادب میں اس طرح بیان کیا ہے

> مثنوی قطب مشتری کے قصے سے خاصی مشابہت رکھنے والے ایک سنسکرت قصے کا دیوستھالی نے "دی ایج آف امپیریل قنوج (The age of imperial kanuj) میں ذکر کیا ہے۔ اس قصے کا نام "نوساہا ساچرتر" ہے۔ اس سنسکرت قصے کا شاعر "پدما گیتا" موسوم بہ پری مالا نے شہزادی سسی پر بھا کی داستان عشق بیان کی ہے۔ یہ شاعر "مری گنگا گیتا" کا فرزند تھا۔ یہ سنسکرت کہانی مالوے کے مدھو راجا نواساہاسنگا※ کی داستانِ محبت سمجھی جاتی ہے۔ "قطب مشتری" اس قصے کے کوئی اٹھارہ سال بعد منظر عام پر آئی تھی۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید وجہی نے اس سے استفادہ کیا ہو۔ بر حال قطب مشتری کے قصے نواساہا ساچرتر میں خاصی یکسانیت موجود ہے۔ (13)

ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی "قطب مشتری" اور "سب رس" کا خاصا جامع تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے ان فن پاروں کے سبھی پہلوؤں کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں جس سے ان کی گہری تنقیدی

بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور اس سے صاحب تصنیف کے مزاج و آہنگ کے ساتھ ساتھ اس دور کی شعری روایت کا درست اور صحیح تاثر سامنے آتا ہے۔ اس فصل کا پانچواں باب" فارسی روایت کی توسیع" ہے۔ اسی میں ڈاکٹر جالبی، عبداللہ، غواصی، ابن نشاطی، قطبی زاری، سید بلاقی، عبداللطیف، معظم، میراں جی حسین خدا نما اور میراں یعقب کا تعارف کراتے ہیں اور ان کا فنی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ غواصی کے تعارف میں اس کی مثنوی" مینا ستونتی" کے ضمن میں جالبی لکھتے ہیں کہ

> مینا ستونتی ایک ہندوستانی الاصل قصہ تھا۔ جو ساتویں صدی ہجری میں ایک عوامی کہانی کی حیثیت سے مقبول تھا اور جسے قدیم ہندی بھاشا میں داؤد نے" چندرائن" میں فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھا۔ حمیدی نے فارسی میں "عظمت نامہ" کے نام سے اس قصے کو اپنے طور سے لکھا۔"(14)

اس کے برعکس سیدہ جعفر اپنی کتاب میں یوں بیان کی ہیں

> غواصی نے کسی فارسی رسالے سے استفادہ کرنے کا جو ذکر کیا ہے۔ اس سے گمان گزرتا ہے کہ غالباً" مینا ستونتی" میں حمیدی کے "عصمت نامہ کی خوشہ چینی کی گئی ہوگی۔ گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ مینا ستونتی" چندرائن" سے ماخوذ نہیں ہیں۔ دونوں میں قصے کا انجام اور بعض دوسرے اختلافات موجود ہیں۔ دوسرے یہ کہ حمیدی نے اپنے قصے کو رزمیہ کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ غواصی نے" مینا ستونتی" کے قصے کو ایک عشقیہ مثنوی کے طور پر پش کیا ہے۔ جس میں بعض نصیحت آمیز باتیں اور خیال انگیز اخلاقی نکات کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔"(15)

چھٹا باب" فارسی روایت کی تکرار" ہے۔ اس میں بھی دیگر ابواب کی طرح اس زمانی دور کی سیاسی و تہذیبی صورت حال کا مختصر بیان ملتا ہے اور جالبی کے مطابق اس دور میں کوئی وجہی یا غواصی جیسا شاعر نظر نہیں آتا۔ اس باب میں تانا شاہ، طبعی، محب، مختار، خواص، فتاصی اور ضعیفی کا ذکر کرتے ہیں اور اس زمانی دور کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں کہ یہ دور پرانی روایت کی

تکرار کا دور تھا۔ اس میں کوئی قبل ذکر تصنیف نہیں ملتی اور قطب شاہی سلطنت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی دکنی زبان کی روایت بھی ختم ہوگئی۔ ساتواں باب" دکنی روایت کا خاتمہ" پر بحث کرتی ہے۔ اس حصے میں سیاسی وتہذیبی طور پر قطب شاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا جس سے دکنی کلچر اور زبان کا معیار ومقام بھی ختم ہوگیا۔ اس باب میں حسین ذوقی، قاضی محمود بحری اور باقر آگاہ کا تذکرہ ملتا ہے جو دکنی ادب کی روایت میں زیادہ اہم نہیں ہیں۔

اس جلد کی فصل ششم بعنوان" فاسی روایت کا نیا عروج ریختہ 1685ء تا 1750ء" ہے۔ اس میں صرف دو باب ہیں۔ پہلا باب" ولی دکنی" پر ہے۔ اس میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ولی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی ولی کا اصل نام" ولی محمد" بتاتے ہیں۔ جالبی صاحب کے تنقیدی جائزہ اس قدر مربوط ہے کہ اس سے ولی کے فن کی اہمیت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

اس فصل کا دوسرا باب" معاصرین ولی اور بعد کی نسل" کے عنوان پر ہے۔ اس میں داؤد اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی اور شاہ قاسم علی قاسم کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس میں سراج اورنگ آبادی کا تذکرہ اور نمونہ کلام دوسروں کے بمقابل زیادہ طویل ہے۔ اس باب کے اخیر میں اس دور کی زبان اس کے اثرات اور ادبی روایت کا مختصر سا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ضمیمے میں" پاکستان میں اردو" کے تحت پانچ مختصر مضامین ہیں۔ پہلا مضمون" پنجاب میں اردو" ہے۔ اس میں انہوں نے پنجابی اور اردو کی مماثلت پر بحث کیا ہے۔ اس کے بعد" سندھ میں اردو" اور" سرحد میں اردو" کے عنوانات پر اردو کی ترقی وترویج پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے کا آخری مضمون" بلوچستان کی روایت" ہے۔ اس جلد کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں انھوں نے کہانی کا انداز اختیار کیا ہے۔

جلد دوم اٹھارہویں صدی کے ادبی جائزے سے متعلق ہے اور یہ دو حصوں

میں 1982ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ادبی تاریخ نگاری کے معیار و اصول مرتب کئے ہیں۔ اور ادبی مورخ کے اصول وضوابط بیان کیا ہے۔ پیش لفظ کے بعد تمہید ہے جو دو باب پر منقسم ہے۔ پہلا باب" اٹھارہویں صدی سیاسی مظہر، طرزِ فکر، تہذینی ومعاشرتی رویے" پر محیط ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ اس زمانے کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں اٹھارہویں صدی کا مزاج اس کا طرز معاشرت اس کی اخلاقیات اور کردار کا بھرپور عکاسی کی ہیں۔ تمہید کا دوسرا حصہ" اردو شاعری رواج کشمکش، اثرات، محرکات ومیلانات" کے عنوان سے ہے۔ اس میں دور انتشار و بیداری میں ترقی کی منزلیں طے کرنے والی اردو زبان اور اس کی ادبی روایت پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ سیاسی، تہذیبی انتشار اور شکست وریخت اردو زبان و ادب کی تشکیل کس طرح کرتے ہیں اس کا بیان یہاں ملتا ہے۔ یہ باب ایک طرح سے پوری کتاب کا خلاصہ بھی ہے۔ اور ان بیانات کی روشنی میں اس زمانے کی لسانی وادبی کارناموں کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اس کتاب میں چھ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں تین باب ہیں۔ اس فصل کا عنوان"شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت" ہے۔ اور اس کا پہلا باب" مذہبی شاعری، روشن علی روشن کا عاشور نامہ، دوسرا باب"لسانی خصوصیات شمال ودکن کی زبانوں کا فرق اور تیسرا باب"مرثیے کی روایت ہے۔

اس دور کی مذہبی شاعری کے متعلق جالبی کا کہنا ہے کہ اس دور کی نظموں میں عام طور پر کوئی گہرا روحانی تجربہ شامل نہیں ہے۔ یہ مذہبی شاعری جس میں جنگ نامے میلاد نامے ہند نامے شہادت نامے اور مرثیے وغیرہ شامل ہیں دکنی روایت کے زیر اثر شمال میں شروع ہوئے اور جالبی کے نزدیک ان کی کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں البتہ لسانی اعتبار سے سترہویں صدی کے

آخر اور اٹھارہویں صدی کی زبان اور شمال وجنوب کی زبان کے فرق سمجھنے کے لیے ان کو اہم سمجھتے ہیں۔اس کی تائید میں انھوں نے عاشورنامے کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہیں۔اور اس دور کے لسانی خصوصیت کا جائزہ لیتے ہیں اور اس شمال وجنوب کی زبان کا لسانی تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

شمال اور دکن کی زبان میں کوئی بہت بنیادی فرق نہیں ہے۔آبرو، ناجی، فائز اور ولی دکنی، اشرف گجراتی اور سراج اورنگ آبادی کی زبان و بیان کم و بیش یکساں ہیں۔"(16)

اس فصل کا دوسرا باب" رزم نامے" سے متعلق ہے۔شروع میں وہ اس صنف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

یہ رزمیہ نظموں سے مختلف نظم ہے۔رزم نامہ اس طویل یا نیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر نے کسی ایسی جنگ کا حال بیان کیا ہو جس کا وہ خود عینی شاہد تھا یا اس نے یہ حالات کسی معتبر راوی سے بنے تھے۔"رزم نامہ"مثنوی کی ہیئت میں یا تو خود فاتح کی فرمائش پر لکھا جاتا تھا۔یا شاعر فاتح سے انعام واکرام پانے کی امید میں خود لکھ کر پیش کرتا تھا یا پھر اس جنگ کے حالات وواقعات سے متاثر ہو کر سب کے فائدے کے لئے ازخود موضوع سخن بناتا تھا۔"(17)

اس باب میں صرف دو رزم ناموں کا تفصیلی تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ایک دکنی اردو میں لکھی ہوئی مثنوی" جنگ نامہ عالم علی خان" جو ایک مجہول الاحوال شاعر غضنفر حسین کی تصنیف ہے۔جالبی کے مطابق اس میں تاریخی واقعات کو سنہ تاریخ دن اور فوجی سرداروں کے درست ناموں کے ساتھ بیان کیا ہے۔دوسرا رزم نامہ ایک اور مجہول الاحوال شاعر سید زاہد ثنا کا تحریر کردہ وقائع ثنا" ہے جس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اسی سال لکھی گئی جس سال پانی پت کی جنگ

لڑی گئی اوراس میں وہ واقعات کا بیان ملتا ہے جو مصنف نے خود دیکھے اور سنے۔اس اعتبار سے یہ ایک معتبر معاصر تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اوراپنی ساخت واقعات کی ترتیب اورانداز بیان کی وجہ سے اس دور کی ایک قابل ذکر تصنیف ہے۔فصل اول کا تیسرا باب"جعفر زٹلی" پر ہے۔اس باب میں جعفرزٹلی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فصل دوم میں دو باب ہیں۔پہلا باب" فارسی ریختہ گو، بیدل،شاہ گلشن وغیرہ" ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ اردوتحریک اور پکڑ رہی تھی۔اس دور میں مستند فارسی گوشعراء نے تفنن طبع کے لیے ریختہ میں شاعری کی وہ صرف سطحی ہے۔جالبی صاحب نے اس باب کے تحت مرزامعزالدین فطرت موسوی،خواجہ عبدالاحد،مرزاعبدالقادر، بیدل،مرزاعبدالغنی بیگ قبول کشمیری،شیخ سعداللہ گلشن،شرف الدین علی خان پیام،مرزامحمدرضا، قزلباش خان،امید ہمدانی اورنواب عمدۃ الملک امیرخان انجام کا ذکر کرتے ہیں۔اس باب میں ان فارسی گوشعرا کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔اس فصل کا اگلا باب" فارسی کے ریختہ گو آرزو مخلص وغیرہ" کے عنوان سے ہے۔جالبی صاحب اس باب میں خان آرزو کا بڑا بھرپوراور مفصل تذکرہ کرتے ہیں جس سے اس دور پر خان آرزو کا کیا اثر تھا واضح ہوجاتا ہے۔اسی طرح آنند رام مخلص کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

فصل سوم کا پہلا باب" ولی دکنی کے اثرات تخلیقی رویے شاعری کی پہلی تحریک ایہام گوئی" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں جالبی صاحب ایہام کی تعریف کی ہے۔اوراس دور کے تہذیبی اور شاعرانہ رویوں کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کا عکس محسوس ہوتے ہیں۔آخری حصے میں شمالی ہند کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر پر بحث کرتا ہے۔اورآبروکو پہلا صاحب دیوان شاعر ٹھہراتا ہے۔

شمالی ہند کے ریختہ گوشعراء میں آبرو پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔جنھوں نے ولی کے انداز پر اپنا دیوان ریختہ مرتب کیا۔"(18)

دوسرا باب" ایہام گوشعراء: آبروؔ" کے عنوان پر ہے۔اس باب میں آبرو کی شاعری کا تنقیدی جائزہ مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔آبرو کی شاعری کی لسانی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اوران کی شاعری کواعلیٰ درجے کی شاعری قرار دیا گیا ہے۔ان کی تخلیقی صلاحیت عمدہ اوران کی زبان شفتہ اورسنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔آبرو کی شاعری کے ذریعے اس دور کی تہذیب کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔انھیں خصوصیات کی بنا پر جالبی آبروؔ کواس دور کے قدآور شاعر قرار دیا ہے۔

اس فصل کا تیسرا باب" دوسرے ایہام گوشعراء" کے حوالے سے ہے۔اس میں احسن اللہ احسن،شاہ ولی اللہ اشتیاق،سعادت علی امروہوی،عبدالوہاب یکرو اور میر محمد سجاد کا ذکر ہے۔ان شعراء کے بارے میں جالبی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ سب دوسرے درجے کے شعراء ہیں۔کیونکہ ان کا ذکر اردو کی ادبی تاریخوں میں کہیں نہیں ملتا ہے۔ان شعراء کے کلام کا تنقیدی جائزہ بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس فصل کا چوتھا باب"غیر ایہام گوشعرا: اشرف، فائز وغیرہ" سے متعلق ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسی دور میں موجود تھے اور ولی سے متاثر بھی تھے۔مگر ایہام گوئی سے باز رکھتے تھے۔ان شعراء میں اشرف گجراتی،شاہ تراب، مبتلا، صابر اورعزلت کا نام آتا ہے۔ان شعراء کے بارے میں اس سے پہلے کی ادبی تاریخوں میں کہیں بیان نہیں کیا ہے۔جالبی صاحب نے بڑی محنت ومشقت کے بعد ان شعراء کے حالات اوران کے کلام کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا ہے۔

فصل چہارم کا عنوان" ردّعمل کی تحریک" ہے۔اس میں تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ" اسباب،خصوصیت اورمعیارسخن" کے عنوان سے ہے۔اس میں ان شعراء کا تذکرہ کیا ہے جو ایہام

گوئی کے ردعمل میں ایک نیا اسلوب اور نیا راستہ اختیار کیا ہے۔اس دور کے شعراء نے زبان کو ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا جواس سے قبل اردو میں رائج نہیں تھا۔اردو زبان میں ہندوی اور فارسی کا حسین امتزاج اس دور کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔اس فصل کا اگلا باب"ردعمل کے شعراء" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مظہر،یقین،تاباں،مہر باقر حزیں،دردمند،اشرف علی خاں فغال اور خواجہ احسن الدین خان بیان کا تذکرہ ملتا ہے۔اس باب میں بھی ہر شاعر کی انفرادی خصوصیات اوران کے کلام کا فنی تجزیہ موجود ہے۔جمیل جالبی کی عمیق مطالعہ کی دلائل ہے کہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ شعراء کو اپنی تاریخ ادب میں شامل کرنے کی سعی کی ہے۔جن شعراء کے حالات اوران کے کلام کا نمونہ جالبی نے پیش کیا ہے ان کے بارے میں اس سے پہلے کی ادبی تاریخوں میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔ادب میں ہونے والی ہر تبدیلی پر وہ گہری نظر ڈالی اور ہر تحریک کی تعریف اوران کے وجود میں آنے کا مقصد اور حالات پر اپنی رائے بھی دیتی ہے۔ردّعمل تحریک کے متعلق ان کہنا ہے

> ردّعمل کی تحریک بھی دراصل فارسی شاعری کی پیروی کی تحریک تھی اور یہ کام فارسی شاعری کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں تھا۔اس دور کا یہ عام رجحان تھا کہ فارسی زبان و شعر کی ساری خصوصیات اور فنی باریکیاں اردو شاعری کے مزاج میں جذب کر دی جائیں۔اس دور کے شعراء نے اس تخلیقی عمل سے فارسی شاعری کے فن اور مزاج کو اس حد تک اردو میں ملایا کہ خود اردو زبان کے شعری وادبی نقوش متعین ہو گئے۔لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی اپنا ریختہ روزمرہ کی عام بول چال کی زبان سے قائم رکھا۔یہ کام میرؔ، دردؔ اور سوداؔ نے بھی کیا اور یہی کام قائمؔ،سوزؔ ،بیانؔ،تاباںؔ، حزیںؔ وغیرہ نے بھی کیا۔اسی لیے سارے فارسی اثرات کے باوجود اس دور کی شاعری میں اردو پن نمایاں رہا اور دیکھتے ہی اردو شاعری نے نئی قوت حاصل کر کے عوام وخواص میں یکساں مقبولیت حاصل کر لی۔"(19)

تیسرے باب کا عنوان" ردعمل کے شعراء: شاہ حاتم" ہے۔اس باب میں شاہ حاتم کے کلام کی فنی خوبیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کی شاعری کے ہر پہلو کا جائزہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔شاہ حاتم کے دیوان قدیم اور دیوان زادہ کا بھی تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ان کے لسانی اور فنی پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔زبان کی اعتبار سے دیکھا جائے تو شاہ حاتم کے دیوان قدیم میں ہندی الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔لیکن دیوان زادہ میں فارسی کا غلبہ نمایاں ہے۔

فصل پنجم کا عنوان" ردعمل کی تحریک کی توسیع" ہے۔اس فصل کے نو ابواب ہیں۔ پہلا باب" میرؔ وسوداؔ کا دور ادبی ولسانی خصوصیات" پر مبنی ہے۔اس میں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس دور کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔اور اس دور کے معاشرتی حالات کا ادب پر ان کے اثرات کا بھی اظہار کیا ہے۔علاوہ ازیں اردو کے اصناف سخن یعنی غزل،مثنوی، مرثیہ،قصیدہ،شہر آشوب وغیرہ کا تعارف بھی کیا ہے۔اس لیے یہ باب اٹھارہویں صدی کے اردو ادب کی ارتقائی منزلوں کی بھرپور تصویر پیش کرتی ہے۔دوسرے اور تیسرے باب" میر تقی میر" پر مبنی ہے۔دوسرے باب میں میرؔ کے حالات اور ان کی تصانیف کا مطالعہ ملتا ہے۔جبکہ تیسرے باب میں ان کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔میرؔ کے سنہ ولادت کے درست تعین میں بہت سے مضبوط دلائل انھوں نے پیش کیا اور اس کی بنا پر میرؔ کا سنہ ولادت 1722ء کو متعین کیا ہے۔اس باب میں میرؔ کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔اس طرح میرؔ کی تخلیقی عمل میں اس دور کے سیاسی وسماجی حالات کس قدر اثر ڈالی ہے اس کی عکاسی کرنے کی بے حد سعی جالبی صاحب نے کی ہے۔میر کی شاعرانہ عظمت کو پختہ کرنے کے لیے جالبی صاحب نے فارسی اور انگریزی کے بڑے بڑے شعراء سے میرؔ کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔یہاں پر ہمیں جمیل جالبی بحیثیت نقاد نظر آتے ہیں۔ایک عمدہ نقاد کی طرح فن کے ہر پہلو کا مطالعہ کر کے ان کی قدر متعین

کرتا ہے۔ میرؔ کی غزلوں کی لسانی تجزیہ جالبی صاحب کی ناقدانہ قوت کو تسلیم کرتا ہے۔ غزل کے علاوہ میرؔ کے دیگر اصناف کا بھی ذکر اس باب میں کیا ہے۔ اس میں مثنوی، مرثیہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس باب کی ایک خامی یہ ہے کہ ایک ہی شاعر پر طویل مضمون پیش کرنے کی وجہ سے اس دور کے دیگر شعراء نظرانداز کئے جانے کا اندیشہ ہوتی ہے۔ اس لیے ادبی مورخ کو ہمیشہ اختصار اور جامعیت کا سہارا لینا چاہیے۔

اس فصل کا چوتھا باب ''مرزا محمد رفیع سوداؔ'' ہے۔ اس میں سوداؔ کی نجی زندگی اور ان کے کلام کا تجزیہ بھی دیا ہے۔ سودا کی تاریخ پیدائش 1706ء بتاتے ہیں۔ سوداؔ اور میرؔ ہم عصر شعراء ہیں۔ اور میرؔ کے مدمقابل سودا کا مطالعہ کم صفحات پر کی ہے۔ یعنی میرؔ کی طرف جتنا توجہ انھوں نے صرف کی ہے اتنا سوداؔ کی طرف نہیں کی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس دور کے شعراء میں میرؔ سے ان کا لگاؤ زیادہ تھا۔ گو ان دونوں شعراء کا تقابلی مطالعہ پیش کیا تھا مگر کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہیں دی گئی ہے۔

اگلا باب ''خواجہ میر دردؔ'' ہے۔ اس مضمون میں ان کا عمیق مطالعہ اور ان کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتی ہے۔ دردؔ کی شاعری پر اپنی تنقیدی نظر ڈال کر ان کے کلام کی فنی خوبیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ کی طرح اس دور کے اردو ادب پر دردؔ کا اثر بھی پڑا ہے۔ چھٹا باب ''قائمؔ، میر سوزؔ، میر اثرؔ کے بیانات پر مبنی ہے۔ قائمؔ کی شاعرانہ صلاحیت پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قائمؔ، میرؔ و سوداؔ کے زمانے کا درجہ دوم کا شاعر ہے۔ قائم کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے جالبی صاحب لکھتے ہیں

> ادبی تاریخ نویسی کا احساس سب سے پہلے ''مخزن نکات'' نے پیدا کیا۔ مخزنِ نکات میں مختلف طبقات کے شعراء کی خصوصیات کے مطالعے سے ہر دور کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اردو شاعری کو تین طبقات میں تقسیم کرتے وقت قائم کے

سامنے کوئی روایت نہیں تھی۔ یہ ان کی اوّلیت ہے اور اس او※لیت کی اہمیت کو وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے زندگی میں کوئی ایسا کام کیا ہو جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔"(20)

قائمؔ کے بعد میر سوزؔ اور اثرؔ کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کی شخصیت ار فنی مہارت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ میر اثرؔ کی مثنوی کا تنقیدی مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے ذریعے اثرؔ کی شاعرانہ عظمت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ جالبی ہر دور کے چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم شعراء کے بارے میں صحیح معلومات رکھتے ہیں۔ اس لیے انھیں ہر دور کے شعراء کی قدر متعین کرنے میں کوئی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ساتواں باب" میر حسن" پر مبنی ہے۔ اس باب میں میر حسن کی شاعرانہ صلاحیت کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سے ہمیں میر حسن کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آٹھواں باب" دوسرے شعراء" ہے۔ اس میں جعفر علی حسرت، میر محمد بیدار، قدرت اللہ قدرت، ہدایت اللہ ہدایت، ہیبت قلی خان حسرت کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان شعراء کی شاعرانہ صلاحیت اور فنی اعتبار سے ان کا مقام درجہ دوم کے شعرا میں ہوتے ہیں۔ اس باب میں ان شعراء کے روایتی انداز اور ان کے طرز ادا کو واضح کر کے ان کی اہمیت کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس فصل کا آخری باب" چند اور شعراء" پر مبنی ہے۔ ان میں شیخ رکن الدین عشق، مرزا محمد علی ندوی، شیخ غلام علی راسخ، محمد روشن جوشش، محمد عابد دل، اور شیر محمد خان ایمان کا تذکرہ شامل ہے۔ اور ان شعراء کے بیانات سے اٹھارہویں صدی کے اردو شعرا کا تعارف مکمل ہو جاتا ہے۔ جمیل جالبی نے جن شعراء کو اپنی تاریخ ادب میں شمار کیا ہے ان کا ذکر اس سے پہلے کسی بھی تاریخ ادب میں نہیں ملتا ہے۔ اس سے جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

فصل ششم بہ عنوان" اٹھارہویں صدی میں اردو نثر" ہے۔ اس فصل میں پانچ باب ہیں۔ اس کا پہلا باب" اردو نثر کے رجحانات، اسالیب و ادبی خصوصیات" ہے۔ اس کے تحت

اٹھارہویں صدی کی نثری تخلیقات کے رجحانات، اسالیب اور ادب کی خاصیت کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ صدی ہے جس میں اردو نثر اپنا قدم جما رہی تھی۔ اور فارسی کے بمقابل اپنا ٹھکانہ بنا رہا تھا۔ اس زمانے میں اردو کی مانگ بڑھ گئی اور عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے لوگ اس زبان کا کثرت سے استعمال کرنا شروع کیا۔ جمیل جالبی کا یہ اظہار خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے

> یہ بات اعماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے اپنا راستہ تلاش کر چکی تھی اور اس میں اتنی تصانیف وجود میں آ چکی تھیں کہ ان کو نظر انداز کر کے اردو نثر کا پہلا مرکز فورٹ ولیم کالج کو کہنا کسی طرح درست نہیں۔(21)

چند مورخین نے فورٹ ولیم کالج کو اردو نثر کا پہلا مرکز عطا کیا تھا۔ اور فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھی گئی تحریروں کو ان لوگوں نے نظر انداز کیا ہے۔ دراصل فورٹ ولیم کالج میں جو بھی کام ہوا ہے وہ طبع زاد نہیں بلکہ ترجمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج سے باہر لکھنے والوں کی تحریریں مطبوعہ صورت میں نہیں تھی یہ بھی اس کی مقبولیت کم ہونے کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ چند نقادوں کا کہنا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر نگاری سادہ اور عام فہم زبان میں ہے۔ اسلیے اس دور کے دیگر نثر نگاری سے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ لیکن جمیل جالبی اس بات کو یوں کہہ کر انکار کیا کہ:

> وہ تصانیف ان کے مخاطب عوام ہیں۔ اردو نثر میں لکھی گئی ہیں۔ ان سب کا اسلوب بیان سادہ و عام فہم ہے۔ یہی وہ اسلوب ہے جو اٹھارہویں صدی کا اسلوب ہے جسے عوام تک اپنی بات پہنچانے کی خواہش نے جنم دیا۔ اس اسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس رنگینی عبارت استعارات مشکل فارسی و عربی الفاظ، پیچیدہ تراکیب سے عام بول چال کی زبان میں اپنی بات کہنے پر توجہ دی گئی ہے۔ اس دور کی عام نثر میں اردو پن نمایاں ہے لیکن اس اردو پن کے باوجود فارسی جملے کی ساخت کا اثر واضح طور پر موجود ضرور ہے۔"(22)

چوتھا باب ”تاریخی نثر، اس کا اسلوب“ پر مبنی ہے۔ اس باب میں اٹھارہویں صدی میں لکھی گئی ایک تاریخی تصنیف ”قصہ واحوال روہیلہ“ کا تعارف تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ اردو کی پہلی باقاعدہ تاریخی کتاب ہے جس میں معاصر واقعات کو اردو میں لکھا گیا ہے۔ جمیل جالبی نے اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس تصنیف کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جالبی صاحب رقم طراز ہے

> اس دور میں جب اردو نثر میں تاریخی کتابیں لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ رستم علی کی
> یہ تصنیف اردو نثر کی ایک نئی روایت کو جنم دیتی ہے۔“(23)

اس فصل کا پانچواں باب ”افسانوی تصانیف اور اسالیب“ ہے۔ اس میں عیسوی خان کا قصہ ”مہر افروز و دلبر“ محمد حسین عطا خان تحسین کی ”نوطرز مرصع“ منشی مہر چند کھتری لاہوری کی ”نو آئین ہندی“، شاہ عالم ثانی آفتاب کی ”عجائب القصص“ اور سید شاہ حسین حقیقت کی ”جذب عشق“ کا ادبی و لسانی جائزہ لیا گیا ہے۔ ”قصہ مہر افروز و دلبر“ کے مصنف عیسوی خان کی شخصیت کا تفصیلی بیان پیش کیا ہے۔ اور اپنی تحقیقی صلاحیت کی بنا پر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس تصنیف کا اصل مصنف عیسوی خان ہی ہے۔ یہاں پر ہمیں جمیل جالبی کے تحقیقی عمل پر فخر محسوس ہوتی ہے۔

میر محمد حسین عطا خان تحسین کی داستان ”نوطرز مرصع“ کا اصل نام ”انشائے نوطرز مرصع“ ہے۔ اس بات کا علم ہمیں جالبی صاحب کی تاریخ ادب سے ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر نوطرز مرصع کے اسلوب دقیق اور رنگین سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جمیل جالبی کا کہنا کچھ اس طرح ہے

> جب کسی زبان کا اسلوب بدلتا ہے تو صرف اسلوب کے بدلنے سے اس زبان کے
> بولنے والوں کے طرزِ احساس کا پتہ لگا کر اس لیے تصور حقیقت تک پہنچا جاسکتا ہے۔
> جہاں وہ قوم اب پہنچی ہے۔ ”نوطرز مرصع“ کے اسلوب کو بلا سوچے سمجھے مکردہ اور
> مصنوعی کہہ کر ہم نے ادبی عوامل کو پورے طور پر نہ صرف سمجھا نہیں ہے بلکہ ادب کو

زندگی سے بے تعلق کر کے پڑھنے کی کوشش کی ہے۔"(24)

میر چند کھتری کی "نو آئین ہندی"، شاہ عالم ثانی کی "عجائب القصص" اور شاہ حقیقت کی "جذب عشق" کے تنقیدی مطالعہ پیش کر کے جالبی صاحب نے اس دور کی داستانوں کی عام روایت سے قاری کو آگاہ کیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ادبی مورخ کو تنقید کے پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے، لیکن جمیل جالبی اپنی تنقیدی بصیرت کی مدد سے اس دور کے ادب کا مجموعی جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ اس سے قاری کو ادب پارہ کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اردو نثر کا یہ باب یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جلد کی تکمیل میں جمیل جالبی صاحب بے حد محنت و مشقت کی ہے۔ کیونکہ اکثر باتوں کی تصدیق کے لیے بہت سارے دلائل انھوں نے پیش کیا ہے۔ اور تحقیق کے دوران اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے باعث یہ جلد مفصل اور معتبر ہے۔

تاریخ ادب اردو- جلد سوم پہلی بار 2006ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت میں کافی دیر لگی ہے۔ اس جلد میں انیسویں صدی کے نصف اول تک کا احاطہ کیا ہے۔ طرز تحریر اور زبان و بیان میں وہی رویہ اختیار کیا ہے جو پچھلی جلدوں کا ہے۔ اس کتاب کو پانچ فصلوں پر تقسیم کیا ہے۔ روایت کے مطابق کتاب کا آغاز پیش لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں جالبی صاحب اپنی اس کتاب کا مختصر سا تعارف کرایا ہے۔ اور اردو کے بیشتر ادیبوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ ادبا کے کلام پر تنقیدی رائے دیتے وقت اس دور کو مدّنظر رکھ کر دیتا ہے۔ ان کا تنقیدی نظریہ بالکل منفرد ہے۔ ان کے نزدیک ہر ایک زبان کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے۔ کسی ایک زبان کے ادیب کو پرکھنے کے لیے دوسری زبان کے تخلیق کار سے مقابلہ کرنے کا عمل سراسر غلط ہے۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہمیں اپنے شاعروں، ادیبوں اور فکشن نگاروں کا اپنے ادب اور روایت کے حوالے ہی سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ چوسر، شیکسپئر، کالرج، اور گوئٹے وغیرہ سے انہیں ملا کر اپنی تہذیبی وسماجی روح کو مسترد کرتے ہوئے کہا جائے کہ اس میں وہ تو نہیں ہے جو شیکسپئر اور گیئٹے کے ہاں ملتا ہے۔ ہماری تہذیبی روح مغرب کی تہذیبی روح سے مختلف ہے۔ اس لیے ایک کے معیار سے دوسرے کو نہیں جانچا جا سکتا۔ مثلاً اردو مرثیے میں ایپک اور ڈراما تلاش کر کے انیس کو ہومر اور شیکسپئر ثابت کرنا ایک بے معنی اور بچا گانہ فعل ہے۔(25)

پھر تمہید ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور ادبی رویّوں کی تبدیلی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ فصل اول کا پہلا باب اردو شاعری کا محرکات ورجحانات، روایت کا سفر، کشمکش، درمیانی کڑیاں، معیارِ سخن، خصوصیات اور اس دور کا لسانی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس باب میں جالبی نے بڑی گہرائی سے انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی تہذیبی، لسانی اور ادبی روایات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کی سماجی زندگی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ لگوں کی زندگی کسی بلند مقصد سے عاری ہو چکی تھی۔ شاعری میں خارجیت کا رنگ گہرا تھا۔ اردو زبان و ادب کا مرکز اس دور میں لکھنو قرار پایا۔ اس طرح یہ باب اس دور کی ایک کھلی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

دوسرا باب "قلندر بخش جرات" پر ہے۔ جرات کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے کلام کا فنی جائزہ بھی اس میں پیش کیا ہے۔ تیسرا باب" انشاء اللہ خان انشا" ہے۔ اس میں بھی جالبی صاحب کی تنقیدی بصیرت کی عکاسی ملتی ہے۔ انشا کی سیرت، شخصیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شعری روایت، انداز اور اسلوب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اگلا باب مصحفی کے اوپر لکھا گیا ہے۔ اس میں مصحفی کی نجی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ پانچواں باب مصحفی کی شاعری

اوران کے فن سے متعلق ہے۔اس میں مصحفی کی ہر تصنیف کا جائزہ لے کر اس پر اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔تاکہ قاری کو مصحفی کا ادبی سفر کے ارتقائی منزلوں سے آگاہ کریں۔ادبی تاریخ میں اس طرح تفصیل کے ساتھ شاعروں کے کلام پر بحث کرنا درست نہیں سمجھا جاتا ہے۔پھر بھی جمیل جالبی کے محققانہ اور ناقدانہ طرز انھیں زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے پر مجبور کیا ہے۔اور اس سے اگلی نسل بے حد فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اس فصل کا چھٹا باب ”سعادت یار خان رنگین“ ہے۔یہ ایک طویل باب ہے۔اس میں رنگین کے حالات، سیرت اور شخصیت کافی طوالت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فصل اوّل کا دوسرا حصہ ”چند دوسرے شعراء: روایت کی تکرار“ کے عنوان سے ہے۔ اس حصے کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ”ثناء اللہ فراق“ کے تذکرے پر مبنی ہے۔ثناء اللہ کے لیے الگ سے ایک باب متعین کر کے جالبی صاحب یہ پیغام دیتا ہے کہ ادبا کا تعارف کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ انداز اختیار کرنا چاہیے۔کیونکہ اس دور کے ناقدین کی نظر میں ثناء اللہ درجہ دوم کے شاعر ہے۔لیکن جمیل جالبی ان کے کلام پر تنقیدی رائے پیش کر کے ان کو اردو ادب میں ایک مقام عطا کیا ہے۔اس حصے کا دوسرا باب ”شیخ ولی اللہ محب حالات وشاعری“ پر ہے۔ان کا سنہ ولادت اس میں درج نہیں ہے۔شاید اس کے بارے میں کہیں درست معلومات نہیں ملی ہوگی۔حالانکہ سنہ وفات مصحفی کے حوالے سے دیا ہے۔اگلا باب یعنی تیسرا باب شہزادہ سلیمان شکوہ کے بارے میں ہے۔خواہ وہ کسی بڑے شاعر تو نہیں پھر بھی ادبی تاریخ میں ان ادبا کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ان کے بارے میں جالبی صاحب کی رائے ہے کہ ان کی شاعری میں کوئی انفرادی خصوصیت نہیں البتہ وہ قابل ذکر اس لیے ہیں کہ انہوں نے دہلی سے لکھنو آکر شعراء کی اس انداز میں سر پرستی کی کہ خود سلاطین اودھ نہ کر سکے۔اس حصے کا آخری باب مرزا محمد تقی خاں ہوس پر مبنی ہے۔یہ بھی اس دور کے عام شاعر ہے۔ان کے حالات اور شخصیت کے ساتھ کلام کی

خوبی اور اس کی قدر و منزلت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

فصل اول کا تیسرا حصہ" روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز" ہے۔ یہ فصل چار ابواب پر منقسم ہے۔ اس میں طالب علی خان عیشی، جسونت سنگھ پروانہ، قاضی محمد صادق اختر اور مہدی علی خان، زکی مرادآبادی کے حالات اور خصوصیات کلام پر مبنی ہے۔ ان شعراء کے ذریعے جالبی صاحب اس دور کی پوری ادبی کیفیت اور ماحول پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

فصل دوم کا عنوان" اردو نثر فورٹ ولیم کالج" ہے۔ یہ پندرہ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات اور اس کالج سے منسلک ادبی شخصیتوں سے متعارف کیا ہے۔ پہلا باب فورٹ ولیم کالج وجود میں آنے کے اسباب اور اس کالج کے قائم کردہ مقاصد پر بحث کرتی ہے۔ دیگر ابواب میں اس کالج سے متعلق ادبی ہستیوں کے حالات اور کارنامے پر مبنی ہے۔ ان میں جان گلکرسٹ، میر امن دہلوی، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان، کاظم علی جوان، حفیظ الدین احمد، خلیل علی خان اشک، مولوی اکرام علی، بینی نرائن جہاں اور مرزا علی لطف شامل ہیں۔ اس فصل کے آخری باب میں فورٹ ولیم کالج کی چند غیر مطبوعہ تالیفات و تراجم کا تذکرہ کیا ہے۔

اس فصل میں جالبی کی تنقیدی تناظر اور محققانہ انداز زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے میں اتنی چابک دستی سے کام لیا ہے کہ ان کے پیش کردہ بیانات معتبر معلوم ہوتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی غیر مطبوعہ تصنیفات کو جگہ دے کر انھوں نے اردو کی ادبی تاریخ میں اور اضافہ کیا ہے۔

تیسری فصل نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب کی درمیانی کڑیاں سے متعلق ہے۔ اس کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں تین باب ہیں۔ جن میں محمد بخش مہجور، عظمت اللہ نیاز

اور غلام علی عشرت کے حالات اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی نثر نو طرز مرصع کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کی ہے۔

اس کا دوسرا حصہ ”رنگین کا نقطہ عروج“ پر بحث کرتی ہے۔ اس میں تین باب ہیں۔ پہلا باب مرزا رجب علی بیگ سرور سے متعلق ہے۔ سرور کی شخصیت اور حالات کے ساتھ ان کی تصانیف کا مختصر مگر جامع تعارف کیا ہے۔ فسانہ عجائب پر ایک عمدہ مضمون اس میں شامل ہے۔ دقیق اور مشکل ہونے کے باوجود بھی فن کے اعتبار سے فسانہ عجائب کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرنے میں جمیل جالبی بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس حصے کا دوسرا باب ”فخر الدین حسین سخن دہلوی سرش سخن“ کے عنوان سے ہے۔ اس میں سخن دہلوی کے سنہ ولادت پر مصنف خود شک کرتے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے ایک سنہ درج کیا ہے۔ یہ دراصل ادبی تاریخ نگاری میں منع ہے۔ کیونکہ قیاس آرائی مورخ کے لیے زیبا نہیں ہے۔ سخن دہلوی کی داستان پر تنقیدی رائے دیتے ہوئے اس کا درجہ فسانہ عجائب سے کم بتاتے ہیں۔ اس طرح کے تقابلی مطالعہ ادبی تاریخوں میں صرف جمیل جالبی کے ہاں ہی نظر آتے ہیں۔ فن پارے کی معیار اور اس کی قدر صحیح طور پر پہچاننے کی قوت جالبی صاحب کی تنقیدی صلاحیت کی گواہی دیتی ہے۔

اس حصے کا تیسرا باب ”جعفر علی شیون“ کے حالات اور فن سے متعلق ہے۔ شیون کی داستان طلسم حیرت“ جسے ضلع جگت کی آخری تصنیف مانا ہے، اپنی تنقیدی زایے سے جالبی صاحب نے پرکھا اور اس کی قدر متعین کیے۔ اس داستان کے بارے میں ان خیال ہے کہ اس میں اس دور کا لکھنوی رنگ موجود ہے۔ لکھنو کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی اس داستان میں موجود ہے۔ فن سے زیادہ یہ داستان تاریخی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس فصل کے آخری حصے میں مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا پہلا باب پنڈت دیا شنکر نسیم کے حالات

اوران کی مشہور مثنوی گلزارنسیم کے فنی اورلسانی پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ پر مبنی ہے۔گلزارنسیم کا تنقیدی جائزے کا اگر مطالعہ کرے تو جالبی صاحب کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور اندازہ قاری کو ہوتا ہے۔اس مثنوی کی خوبیوں اور خصوصیات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری اسے پر لطف کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔اوران کے سامنے معنی کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔

اس حصہ کا دوسرا باب نواب مرزا شوق" ہے۔اس میں ان کے حالات کا جائزہ معتبر حوالوں کے ساتھ دیے ہیں۔اورشوق کی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔شوق کی تینوں مثنویوں کا ذکر ملتا ہے۔یہاں فریب عشق، بہارعشق اورزہرعشق کے فنی پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس جلد کی آخری فصل دو باب کے تحت پیش کیے ہیں۔اس میں انیسویں صدی کی دو اہم ادبی وتہذیبی شخصیات کے تعارف پر مبنی ہے۔پہلا باب اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کے حالت اورتصانیف کے مطالعے پر مبنی ہے۔اس باب میں واجد علی شاہ کے فن اوران کے ادبی ذوق پر مفصل بیان ملتی ہے۔اودھ کے سیاسی اورسماجی پس منظر کا نقشہ تمہید کے طور پر پیش کیا ہے۔واجد علی شاہ کے زمانے میں اردوادب کی ترقی وترویج ہوئی ہے اسے کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس فصل کا دوسرا اور آخری باب "نظیر اکبرآبادی" پر ہے۔اس میں جمیل جالبی وضاحت کے ساتھ اردوادب میں نظیر اکبرآبادی کی خصوصیت اوراہمیت پر بحث کیا ہے۔اس میں نظیر کے حالات کے ساتھ ان کا شاعرانہ مزاج اورشخصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔جالبی صاحب اپنی تنقیدی نگاہ سے ان کی شاعری اورفن پر کھل کر بیان کیا ہے۔نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا لسانی مطالعہ کرتے ہوئے جالبی صاحب نے اٹھارہویں اورانیسویں صدی کے لسانی

اور ادبی تغیرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کے بیانات جالبی صاحب کے تنقیدی بصیرت کا نتیجہ ہے۔ نظیرا کبر آبادی اردو ادب میں ایک صدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا طرز و انداز اردو شاعری میں ایک نیا لہجہ پیدا کر دیا۔ نظیر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے جالبی صاحب کہتے ہیں کہ نظیر نے روایت غزل سے انحراف کر کے مسلسل غزل اور موضوعاتی غزل کو رواج دیا جس سے غزل نظم کے قریب آ گئی۔

اس جلد میں جمیل جالبی نے اردو ادب کے معروف اور غیر معروف شعراء کو بھی شامل کیا ہے۔ اور ہر ایک کا تعین قدر بھی کیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے حوالہ دینے کی سعی کی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی عمل سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ عموماً ادبی تاریخ میں گنے چنے ادیبوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن جمیل جالبی کی یہ ادبی تاریخ اس لحاظ سے ان سب سے الگ اور منفرد ہے۔

جلد چہارم دو حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول میں انیسویں صدی کے نصف آخر کی صورت حال کا اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تین فصلیں ہیں۔ فصل اول کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ غالب کے لیے وقف کر دی گئی ہے۔ یہ حصہ 198 صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں اس دور کے ممتاز شعراء پر تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں شاہ نصیر دہلوی، محمد ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، مؤمن خان مؤمن اور مصطفیٰ خان شیفتہ کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں چند اور ممتاز شعراء: روایت کی اشاعت کے تحت سید علی غمگین، میر نظام الدین ممنون دہلوی، نواب محمد اصغر علی، میر مہدی حسین مجروح، قربان علی بیگ سالک، قلق میرٹھی، نظام رام پوری، ظہیر دہلوی اور انور دہلوی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تمہید میں اس دور کے سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کی سیاسی صورت حال بیان کرتے ہوئے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

> انیسویں صدی کا نصف آخر برعظیم کی تاریخ کا فیصلہ کن دور تھا۔ انگریز دو تہائی ہندوستان پر قابض تھے اور اب پورے ہندوستان پر قبضے اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔(26)

جالبی نے غالبؔ کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا ہے۔اس سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ جالبی غالبؔ کا بڑے دلدادہ ہیں۔ پہلے حصے کا پہلا باب" غالب اور ان کا دور، پس منظر، اثرات و رجحانات" کے عنوان پر ہے۔اس باب میں غالب جس عہد میں پلے بڑھے ہیں اس دور کی سماجی و سیاسی صورت حال کی عکاسی کی ہے۔غالبؔ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں وہ بڑا پر آشوب تھا۔مغلیہ حکومت اور اس کا جاہ وجلال سب کچھ تاریخ کے صفحات میں گم ہونے کو بے چین تھا اور نئے مگر غیر ملکی فرماں رواصریر آرائے سلطنت ہو رہے تھے۔ان حالات کے جبر کا اثر غالب کی فکر پر بھی پڑا جس کا اظہار ان کی شاعری اور نثر دونوں میں ہوا ہے۔اس دور کے بارے میں جالبی صاحب لکھتے ہیں۔

> غالب جس دور میں زندہ تھے وہ عبوری دور تھا۔وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کے خاندان کا تعلق "غدر" سے بہت پہلے انگریزوں سے قائم ہو چکا تھا۔غالب نے اس تبدیلی کو اپنے باطن میں محسوس کیا۔(27)

دوسرے باب میں غالب کے آباء واجداد، دور اطفال، اور رہن سہن، مالی حالت، شاعری کا آغاز اور طرز انداز اور ان کی انفرادیت، کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے اہم نکات جیسے پینشن کا قضیہ، کلکتہ کا معرکہ وغیرہ پر بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔۔اس مضمون میں جو باتیں پیش کی ہیں وہ دراصل اردو ادب کے لیے ایک زخیرہ نما ہے۔یہ باب غالب کی ادبی و نجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔غالب کے بارے میں یا ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ معلومات اس میں شامل کیے ہیں وہ منظم اور مربوط ہے۔جالبی

صاحب نے غالب کے اشعار کی جو تشریح وتوسیع کی ہیں اس سے ان کے تنقیدی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غالبؔ کے عہد میں ہندوستان کی غیر مستحکم حکومت مغلیہ کا شیرازہ بکھر رہا تھا دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری بڑھتی جارہی تھی گویا زندگی اور تمدنی انقلاب کے نئے نئے تقاضوں سے ہندوستانی عوام نبردآزما تھے۔ ان مایوس کن حالات میں غالبؔ نے اپنے کلام میں تخیل کی بلندی اور اپنے منفرد اور اچھوتے طرز بیان سے اردو کو ایک نئی قسم کی شاعری اور فلسفہ حیات سے روشناس کروایا، دراصل غالب کی شاعری کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے متعدد بار غائر مطالعہ کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے۔ غالب کی شاعری کے طرزِ ادا پر جالبی صاحب رقم طراز ہیں

> غالب کے زمانے تک اظہارِ خیال کے دو راستے مقرر تھے۔ ایک راستہ استاد ذوق کا تھا جس میں اردو زبان کو بول چال کی زبان سے قریب رت رکھنے کی کوشش میں محاوروں اور روزمرہ کو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ شاعری کی یہی راہ پسندیدہ و مقبول تھی۔ دوسرا راستہ فارسیت کا تھا جس کے ذریعے اعلیٰ خیالات ادا کیے جاسکتے تھے۔ غالب نے اپنے لیے یہی راستہ اختیار کیا اور اس لیے کیا کہ ان کی فکر کا اظہار صرف محاورات، رعایت لفظی ومعنوی یا لفظوں کے مروجہ معنی سے نہیں ہوسکتا تھا اسی لیے انھوں نے فارسی زبان کا سہارا لے کر ''زبانِ غالب'' ایجاد کی۔(28)

تیسرے باب میں غالب کی سیرت، شخصیت اور مزاج پر گفتگو کی ہے۔ غالب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج دوسروں کے کہنے پر تبدیل نہیں کرتے۔ ادبی دنیا کے ہر کونے سے ان کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ مگر غالب کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اس پر جمیل جالبی صاحب یوں رقم طراز ہیں

> ان کے عام کردار، ان کے مذہب وعقائد اور اخلاق پر نہ صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا

جاتا ہے بلکہ ان کی شاعری کو بھی قبول نہیں کیا جاتا مگر وہ اپنے راستے پر نہایت ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔(29)

چوتھے باب میں غالب کی تصانیف وتالیف اردو اور فارسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو تصانیف میں گل رعنا، دیوان غالب، عود ہندی، اردوئے معلّٰی، نکاتِ غالب اور رقعات غالب، قادر نامہ، انشائے غالب، نامہ غالب اور تیغ تیز پر بحث کی ہے۔ فارسی کلام میں پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، کلیات نثر غالب، قاطع برہان، درفش کاویانی، کلیات فارسی (نظم)، سبدِ چین، باغ دو در، رسالہ فنِ بانک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تصانیف غالب کی ہیں۔ لیکن اس باب میں ان کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے جمیل جالبی صاحب لکھتے ہیں:

یہ وہ تصانیفات، تالیفات اور تراجم وغیرہ تھے جنھیں غالب نے اپنی زندگی میں خود مرتب کیا۔ (30)

پانچواں باب غالب کی اردو شاعری پر مبنی ہے۔ اس باب میں غالبؔ کی شعری محاسن تلاش کرتے ہیں۔ یہاں جالبی اپنا تنقیدی شعور کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ غالبؔ اردو کے ایک نامور شاعر ہیں۔ ان کا شعری لب ولہجہ منفرد ہے۔ تخیل کی بلندی، شوخیٔ فکر اور فلسفی انداز ان کے کلام کی پہچان ہوتی ہے۔ غالب کے فلسفیانہ انداز پر گفتگو کرتے ہوئے جالبی رقم طراز ہیں:

غالب نے اپنی شاعری میں فکر و فلسفہ کو اس درجے پر پہنچایا ہے۔ جس پر گوئٹے نے یورپ کو اپنی شاعری سے پہنچایا تھا۔ غالب کا فلسفہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر الہامی ہے اور اس کا اہم ثبوت یہ ہے کہ جو فلسفیانہ باتیں انھوں نے اپنی شاعری میں کہی ہیں ان میں ہر قسم کا فلسفہ دیکھا جاتا رہا ہے۔"(31)

چھٹا باب غالب کی فارسی شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے فارسی کلام کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص کر ان کی فارسی غزلیں، مثنویاں اور قصائد پر نمونہ کلام کے ساتھ اپنی ناقدانہ بصیرت کے سہارے بیان کیا ہے۔ غالب کے فارسی کلام پر بحث کرتے ہوئے جالبی لکھتے ہیں:

> غالب کا اصل کمال آج دراصل ان کی فارسی غزل میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ہر اثر سے بلند اٹھ کر، وارفتگی کے عالم میں، اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھاتے ہیں۔(32)

اس حصّے کے آخری باب میں غالب کی اردو نثر نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالب کے خطوط پر خاصا توجہ دیا ہے۔ غالب کے خطوط اردو ادب کا ایک اہم سرمایہ ہے۔ ان سے اس دور کی سیاسی سماجی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ خاص طور ایام غدر اور اس کے بعد کے چشم دید حالات اس خطوط میں بیان ہوئے ہیں۔ بہت سے خطوط شاگردوں کے نام ہیں جن میں ان کے کلام پر اصلاح دینے کے ساتھ زبان و بیان کے نکات بتائے گئے ہیں۔ غالب نے خطوط نگاری کے ذریعے اردو نثر کو نیا راستہ دکھایا۔ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا جس میں بے تکلف عبارتیں ہوتیں، مسجع و مرصع عبارتوں سے بھی پاک تھیں۔ غالب خط نہیں لکھتے تھے بلکہ بات چیت کرتے تھے۔ جالبی لکھتے ہیں:

> غالب کے خطوط سے ایک زندہ، جیتی جاگتی، بلا کی ذہین اور طباع شخصیت نظروں کے سامنے ابھرتی ہے۔ یہاں پورا غالبؔ اپنی ہستی کے اچھے برے، قوی اور کمزور پہلوؤں کے ساتھ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے موضوع پر بات کرتا ہے۔ (33)

فصل دوم کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کو اردو مرثیہ کا عنوان دیا ہے۔ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ باب اول میں اردو مرثیہ کی روایت اور ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ اس

میں اردو مرثیے کے قدیم شعراء کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس میں میر مستحسن خلیق، میر ضمیر وغیرہ شامل ہیں۔ شاہ نصیر اپنے دور کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری احساس و جذبہ کی شاعری نہیں ہے، بلکہ ان کے ہاں سارا زور معنی آفرینی اور خیال بندی پر ہے۔

دوسرا باب شیخ محمد ابراہیم ذوق کے سوانح حالات اور ان کی شاعری پر مبنی ہے۔ ان کی سنہ پیدائش 1788ء قرار دیے ہیں.※ آب حیات میں جو تاریخ درج کی ہے، جالبی صاحب نے دلائل کے ساتھ اس پر انحراف کرتے ہیں۔ اس باب میں جالبی صاحب ذوق کی غزلیں ،قصائد اور رباعی پر بھی تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ذوق کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں

> ذوق کا کمال یہ ہے کہ وہ روایتی خیالات کو بنا سنوار کر اس طرح مکمل کر دیتے ہیں کہ شعر ضرب المثل بن جاتا ہے۔ (34)

تیسرے اور چوتھے باب میں بہادر شاہ ظفر اور مؤمن خان مؤمن کے حالات اور ادبی سفر کا ذکر کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے حالات بیان کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاہی محل میں رہ کر بھی ظفرؔ عام لوگوں کی زبان میں شعر قلم بند کرتے تھے۔ بول چال کی زبان استعمال کرنے کی وجہ سے ان کے ہاں اردو پن نمایاں ہے۔ ظفرؔ نے غزل کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف ادب پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ظفرؔ کی زبان میں اردو پن یعنی ہندوستانیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مؤمن خان مؤمن کا سال ولادت اکثر تذکروں میں غلط درج کیا ہے۔ جالبی صاحب کے نزدیک ان کا سنہ پیدائش 1214ھ ہے۔ مؤمن کے حالات زندگی پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کی شاعری کی فنی خوبیوں کو نمونہ کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے اردو اور فارسی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ مؤمن کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ تفصیل کے

ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب مصطفیٰ خان شیفتہ پر مبنی ہے اس باب میں انیسویں صدی کے درمیان میں جو ممتاز شعراء تھے ان میں غالب، مومن، ذوق، آزردہ، صہبائی وغیرہ کے ساتھ شیفتہ کا نام بھی نمایاں تھا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ علم وادب کے رسیا تھے اور خط اور کئی فارسی خطوط شیفتہ کے نام محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ دوسروں کے نام غالب کے اردو خطوط میں کم وبیش بیس جگہ شیفتہ کا ذکر آیا ہے۔ ۱۸۴۷ء میں جب غالب، قمار بازی کا اڈا چلانے کے الزام میں گرفتار وقید ہوتے ہوئے تو شیفتہ وہ واحد قابل ذکر شخص تھے جو باقاعدگی سے ان سے ملنے کے لیے جیل خانے جاتے اور ان کی دیکھ بھال اور مدد کرتے تھے۔ اس زمانے میں غالب کے بہت سے اعزاز واقارب نے ان سے منہ پھیر لیا تھا اور نواب لوہارو نے تو آگرہ اخبار میں یہ بیان بھی شائع کرادیا تھا کہ غالب سے ہماری نسبی تعلق ہے، کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔

نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ تخلص اردو، حسرتی فارسی، ۱۸۶۹ء تا ۱۸۰۹ سرفراز الملک نواب مرتضی خان بہادر مظفر جنگ کے بیٹے اور مومن خان مومن کے شاگرد تھے۔ ان کا خاندان بنگش قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نواب محمد مرتضی خاں مرہٹوں کی فوج میں سردار تھے اور انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان جنگ میں انھوں نے ایسا کرایا کہ لارڈ لیک نے خوش ہو کر ۱۸۱۳ء میں گوڑ گاواں کے علاقے ہوڈل و پلول کو بطور جاگیر مع خطابات مرتضیٰ خاں کو تاحیات دے دیا۔ ۱۸۱۴ء میں نواب محمد مرتضیٰ خاں نے جہانگیر کا علاقہ نیلام میں خرید کر اپنے بیٹے محمد مصطفیٰ خاں کے نام سے رکھ دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی مطابق ان کی پیدائش ۱۲۲۴ھ ہے۔ اور انہوں اپنی شاعری کا آغاز ۱۶ سال کی عمر سے شروع کیا اور بیس سال تک ان کی شاعری میں نکھار آ گیا تھا اور اپنے دل کی بات شعر کی زبان سے ادا کر رہے تھے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کریں:

کل شیفتہ سحر کو عجب حال خوش میں تھے
آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا
جس کی شمیم زلف پہ میں غش ہوں شیفتہ
اس نے شمیم زلف سنگھائی تمام شب
ذرا نگاہ کرو شیفتہ کی شوخی کو
دھرا ہے پہلو میں ہنگام کار آئینہ
جب پڑی لذت ہم آغوشی
پھر بغل میں کہاں کتاب رہے

شیفتہ بہت ذکی اور ذہن انسان تھے رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے اپنے وقت کے بہترین استادوں سے تعلیم پائی۔شیفتہ بزرگان دین سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔دہلی میں شاہ محمد اسحق محدث سے بیعت کرکے ان کے مرید ہوئے۔ان کے بعد شاہ غلام علی نقش بندی سے پھر شاہ عبدالغنی مجددی سے کسب فیض کرکے مسند خلافت حاصل کی۔

شیفتہ نے اپنی تصانیف بھی بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

گلشن بے خار: اس تصنیف میں اردو شعرا کا تذکرہ ہے جس میں تراجم فارسی زبان لکھے گئے ہیں اور انتخاب کلام اردو اشعار پر مشتمل ہے۔

رہ آورد [سفرنامہ حج]: شیفتہ کی ایک اور تصنیف ان کا وہ سفرنامہ ہے جو خوبصورت روزنامچہ انھوں نے اپنے سفر حج کے بارے میں فارسی زبان میں لکھا تھا۔

الف: دیوان رسقعات فارسی، ب: کلیات شیفتہ وحسرتی

شیفتہ کے بیٹے نواب محمد علی خان بہادر کی فرمائش پر حالی کی لکھی ہوئی "تفریظ" کے ساتھ ۱۸۸۷ء میں دیوان ورقعات فارسی نیوامپریل پریس سے شائع ہوا۔

بقول جمیل جالبی شیفتہ کی شاعری میں ایک راگ ضرور ہے لیکن یہ راگ اور دھیما اور دبا دبا سا اس لیے ہے کہ انہوں نے شاعری کو اشغال عالیہ اور فن شریفہ میں شمار نہیں کیا اور اس پر توجہ نہیں دی جو تخلیق توانائی کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری تھی۔ ان کے کلام میں اچھے اشعار کی تعداد آج بھی اتنی ہے کہ اس دور کے بڑے شعراء کو چھوڑ کر دوسرے ہم عصر شعرا کے ہاں نہیں ملے گی۔ ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نوجوان حالی کی تربیت کر کے اردو شاعری کو جدید دور میں داخل کرنے کا راستہ دکھایا جس کا اعتراف کرتے ہوئے حالی کی تربیت کر کے اردو شاعری کو جدید دور میں داخل کرنے کا راستہ دکھایا جس کا اعتراف کرتے ہوئے حالی نے کہا کہ شیفتہ کی صحبت میں میرا طبعی میلان، جواب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ وہ درخت جسے مولانا حالی نے پروان چڑھایا اس کا بیج شیفتہ ہی نے ڈالا تھا۔

لب میں اگر نہیں تو ہمارے سخن میں ہے

جو خاصیت کہ اس لب اعجاز فن میں ہے

اس کے علاوہ فصل اول میں ہی ڈاکٹر جمیل جالبی نے چند اور ممتاز شعراء کے تحت علی غمگین دہلوی، میر نظام الدین، نواب محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی، میر مہدی حسین مجروح، قربان علی بیگ سالک، قلق میرٹھی، نظام رام پوری، ظہیر دہلوی، انور دہلوی جیسے شعراء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے حالات زندگی، ان کے کلام اور تصانیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

فصل دوم اردو مرثیہ سے متعلق ہے جس میں جمیل جالبی نے اردو مرثیہ، روایت ا ارتقاء، پس منظر، انیس و دبیر کے پیش رو میر مستحسن خلیق، میر ضمیر، میاں دلگیر، مرزا جعفر علی فصیح پر روشنی ڈالی ہے۔ باب اول میں مرثیے کی تعریف اور اس کے اقسام پر گفتگو کرتے ہوئے جالبی

صاحب لکھتے ہیں

> مرثیہ عام لغوی معنی میں اس "نظم" کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی مدح وتعریف کی گئی ہو۔ اس تعریف کی رو سے مرثیہ دو قسموں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک وہ غیر مذہبی مرثیہ جو کسی عظیم ہستی یا کسی دل بند کے مرنے پر دل موزی کے ساتھ لکھا گیا ہو۔۔۔۔ دوسری قسم کا مرثیہ وہ ہے جس میں حضرت امام حسین کی شہادت کو موضوع سخن بنا کر ان کی اور ان کے انصاروں کی مدح سرائی، مذہبی عقیدت اور غم والم کے جذبات کے ساتھ کی گئی ہو۔ (35)

جالبی نے مرثیے کے اقسام بتاتے ہوئے اس کی کئی مثالیں بھی پیش کیا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ہیئت اور موضوعات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اردو کے مختلف محققین و ناقدین کا حوالہ بھی دیا ہے۔ شعراء کے سنہ ولادت دیتے ہوئے اس پر مختلف لوگوں کی رائے بھی دی ہے۔ شعراء کی شخصیت و سیرت ان کے شاعرانہ محاسن، کلام کی خصوصیات وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اردو مرثیہ کا نقطہ عروج" کے ذیل میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میر انیس کے سال ولادت پر اہل علم میں جو اختلاف ہے ان کو بھی زیر بحث لائی گئی ہے۔ امیر احمد علوی، مولانا شبلی، اکبر حیدری کاشمیری اور مسعود حسن رضوی نے جو تاریخیں انیسؔ کی پیدائش سے متعلق بتایا ہے ان سب کو شامل کیا ہے۔ اور جالبی صاحب ان میں سے شبلی اور اکبر حیدر کاشمیری کی دی ہوئی تاریخ کو مستند مانتے ہیں۔ لیکن سنہ وفات پر یہ سب لوگ اتفاق ہونے کی وجہ سے اسے مستند قرار بھی دیا ہے۔ انیسؔ کی شاعری کا موضوعاتی اور لسانی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اور انیس کے کلام پر اردو ادب کے دیگر تنقید نگاروں کے خیالات کو بھی جگہ دی ہے۔

باب دوم میں مرزا دبیرؔ پر تفصیلی بحث چھیڑی ہے۔ دبیر کی سال پیدائش پر ایک ہی

تاریخ درج کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سب متفق ہیں۔ دبیرؔ اور انیسؔ کی شاعری کا موازنہ بھی کیا ہے۔ دونوں کے مرثیے کے چہرہ پر جو خیالات جالبی صاحب نے دی ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> انیسؔ کے" چہرے" میں مثنوی کا مزاج نمایاں ہے۔جس میں محمد تقی میر کا رنگ بھی جھلک رہا ہے یہاں طرز کررومانوی ہے۔۔انداز بیانیہ میں نرمی ہے، راگ اور لے میں دھیما پن ہے اور لہجے میں نرمی ونسائیت ہے۔ اس کے برخلاف دبیر کے" چہرے" کی منظر نگاری میں قصیدہ کا رنگ جھلک رہا ہے۔اس کا آہنگ بلند اور لہجے میں خطیبانہ مردانہ پن ہے۔(36)

اور دونوں کو برابری کا مقام دیا گیا ہے۔ مرثیے کے علاوہ دبیرؔ کی سلام ورباعی پر بھی انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اور دونوں کی مرثیہ نگاری پر موازنہ کرتے ہوئے جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

> ''مرثیہ انیس ودبیر کے ہاں اپنے نقطۂ عروج اور درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور یہ دونوں اس کے سارے امکانات کو اپنے تصرف میں لاکر دوسرے مرثیہ نگاروں کے لیے، سوائے اس روایتِ مرثیہ کی تکرار کے کچھ نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے میر انیس اور مرزا دبیر کو خواتم مرثیہ کہنا چاہیے۔'' (37)

فصل دوم کے تیسرے حصے میں ''روایت کی تکرار دوسرے مرثیہ گو'' میر مونس، میر عشق، میر تعشق، مرزا محمد جعفر اوج، میر نفیس، پیارے صاحب رشید کے حالات اور کارنامے بیان کیے ہیں۔ انیس اور دبیر کے بعد جتنے بھی مرثیہ گو منظر عام پر آئے وہ تمام ان دونوں کی پیروی کرتے رہے۔ اس کی وضاحت ان الفاظ میں جمیل جالبی کرتے ہیں

> ''مرثیہ، انیس ودبیر کے ساتھ نقطہ کمال کو پہنچ کر رک جاتا ہے اور آنے والا مرثیہ گو اسی روایتِ مرثیہ کو دہراتے اور اس کی تکرار کرتے ہیں۔''(38)

چوتھی جلد کے اس حصے کو جمیل جالبی نے چھ ابواب پر تقسیم کیا ہیں۔ ہر ایک شاعر کے لیے ایک باب مقرر کیا گیا ہے۔ چار یا پانچ صفحوں پر شعراء کے حالات اور ان کے کلام کی خوبی اور نمونہ کلام پیش کیے گئے ہیں۔ انیسؔ اور دبیر کے مقابلے میں ان شعراء کا تفصیلی جائزہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس باب میں کل 16 مرثیہ گو شعراء کے حالات اور ان کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور میں اور بھی مرثیہ گو شعراء تھے۔ لیکن ان کا تذکرہ اس میں نہیں کیا گیا ہے۔

فصل سوم کے دو ابواب ہیں۔ پہلا باب ''دور جدید کی توسیع: اردو نثر کا تنوع'' اس کے ضمن میں طنز و مزاح کی روایت، اودھ پنچ: اشاعت و خصوصیات اور اودھ پنچ کے بانی و مدیر منشی سجاد حسین کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اردو میں طنز و مزاح کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اودھ پنچ کس طرح عمل میں آیا اور سرسید کا اس میں کیا اہم رول تھا ان ساری باتوں کی تفصیل باب اول میں دیا گیا ہے۔ منشی سید سجاد حسین کے حالات اور زندگی کے اہم نکات کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ منشی سجاد حسین کے فن پر یوں بیان کیا ہے

> ''سجاد حسین کا یہ انداز بیان نہ صرف لطف دیتا ہے بلکہ حد درجہ دلچسپی پیدا کر کے فنی اثر کو بھی بڑھا دیتا ہے۔'' (39)

اسی باب میں اودھ پنچ کے ممتاز لکھنے والوں کے حالات اور ان کی فنی خوبیوں پر مختصر طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں سب سے پہلا نام مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کا ہے۔ پھر جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب دوم کے دوسرے حصے میں اکبرالہ آبادی کے حالات اور ان کے کلام پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل یہ مضمون اکبرالہ آبادی کے ہر فنی پہلوؤں پر گفتگو کرتی ہے۔ اکبرالہ آبادی جس دور میں شاعری کی تھی اس دور کا پس منظر بھی جالبی نے روشنی ڈالی ہے۔ اکبرالہ

آبادی کی شاعری کے لہجے پر یوں رقم طراز ہیں

''اکبرالہ آبادی کے مزاح کی بنیاد سنجیدگی پر قائم ہے۔ وہ تنقیدِ حیات پیش کر کے دعوتِ فکر دیتی ہے۔مزاحیہ شاعری میں بھی انھوں نے غزل کے آہنگ ہی کو اپنایا اورغزل کے عام رنگ میں لکھتے لکھتے ذکاوت کا رنگ شامل کر دیا۔''(40)

تاریخ ادب اردو کے جلد چہارم کے دوسرے حصے میں سب سے پہلے سر سید اور ان کے رفقاء کے حالات اور کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔روایت کے مطابق سب سے پہلے اس دور کی سیاسی وسماجی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد سر سید کے سوانح حالات اور ان کے تصانیف کا بھر پور جائزہ لیا گیا ہے۔سر سید کے ہر ایک پہلو کو الگ الگ عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔سر سید کے رفقاء میں خواجہ الطاف حسین حالی،محمد حسین آزاد،شبلی نعمانی اور نذیر احمد کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر ایک مصنف کے حالات زندگی، تصانیف، سماجی و سیاسی شعور،فن اور اسلوب نگارش پر ہماری جو معلومات تھی جالبی نے اس میں اضافہ کر دیا ہے۔

فصل جہارم میں اردو داستان کی تاریخ بیان کی ہیں۔تمہید میں داستان کے رواج اور عروج کے بارے میں ایک معلومات افزا مضمون پیش کیا ہے۔داستان میں اس دور کی جھلک ضرور ملتی ہے۔دراصل اس میں اس دور کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہیں۔بقول جمیل جالبی

''داستان قدیم اور نظروں سے اوجھل ہونے والی تہذیب کا رنگ و مزاج ہے جو انیسویں صدی میں بھی ڈوبتے سورج کی طرح نمایاں تھا۔''(41)

سب سے پہلے طلسم ہوش ربا کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔یہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کی ایک ضمنی داستان ہے۔اس کے بعد بوستان خیال کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دو طویل داستانوں کے بعد داستان نویس رتن ناتھ سرشار کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں جمیل جالبی نے سرشار کی فسانہ آزاد کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔داستان

کے بعد جالبی سفر نامے کی تاریخ بیان کیا ہے۔ ''تاریخ یوسفی'' اردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مصنف یوسف خان کمل پوش ہے۔اس سفر نامہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہیں۔کریم خان کا سیاحت نامہ کا بھی انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ یہ اصل میں ایک روز نامچہ ہے،جس میں روزمرہ کی بات اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔اسی نوعیت کی ایک اور تصنیف مظہر علی سندیلوی کا روز نامچہ ہے۔اس میں 1839ء سے لے کر 1911ء تک کے اہم واقعات درج کیا گیا ہے۔

اردو نثر کے ذیل میں انیسویں صدی کے اہم مذہبی تصانیف کا بھی جالبی نے ذکر کیا ہے۔تقویت الایمان،تذکرہ غوثیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اردو تذکروں کے نثری اسلوب کا بھی انھوں نے جائزہ لیا ہے۔گلشن ہند،خوش معرکہ زیبا،گلستان سخن،تذکرہ طبقات الشعرا،انتخاب یادگار وغیرہ پر مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ ادب میں جمیل جالبی نعت گویوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔محسن کا کوروی اور کرامت علی خان شہیدی کا جائزہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیے ہیں۔اس فصل کے چوتھے حصے میں انیسویں صدی کے اواخر کی شعری حسن،امیر مینائی کلام کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس دور کے دیگر اہم شعراء کا بھی تذکرہ انھوں نے پیش کیا ہے۔اس میں داغ دہلوی اور اسمٰعیل میرٹھی کا شمار کیا گیا ہے۔

تاریخ ادب اردو: وہاب اشرفی

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تاریخ ادب اردو ابتداء سے 2000ء تک اب تک لکھی جانے والی تواریخ ادب میں سب سے ضخیم تاریخ ہے۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ میں اردو کے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کے قلم کاروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ تاریخ 2005 میں منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو بھی ضخیم ہے، لیکن وہ اردو کے آغاز سے لے کر عہد سرسید پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہاب اشرفی محقق سے زیادہ ایک نقاد کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ وہ صرف اردو ادب کے سرمایے پر ہی نہیں بلکہ عالمی ادب پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔ عالمی تنقید کے جدید رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی تحریروں میں وسعت وزن اور وقار ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے احوالِ واقعی یہ تاریخ ادب اردو کیوں؟ کے عنوان کے تحت تاریخ ادب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی تاریخ ادب کے مقاصد اور تقاضوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ بتایا ہے کہ ایک مورخ کو غیر جانبدار ہونا چاہیے ایسی بھی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جہاں مصنفوں میں اپنی ذاتی تعصب کی وجہ سے گراں قدر شخصیتوں کو اپنی احاطہ تحریر سے باہر کر دیا ہے۔ آب حیات کا حوالہ بھی دیا ہے کہ پہلی بار آب حیات شائع ہوئی تو مومن خان مومن کو شاعر کی حیثیت سے جگہ نہیں دی گئی تھی۔ جب بعد میں دباؤ بڑھا تو مؤمن کو شامل کر دیا گیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی اس راز سے بھی واقف ہیں کہ تسامحات، اغلاط دانستہ فریب کاری، بیانات میں غلو، خواہ مخواہ کی طوالت، نئے تحقیقی انکشافات سے بے خبری وغیرہ کسی ادبی تاریخ کو ناقص ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئی تحقیقات کا بیش بہا خزانہ جو سامنے آیا ہے جس کی بدولت تذکروں کے اغلاط کی تصحیح کا کام سرانجام پاتا رہا ہے، اس سے

فیض یاب ہونا ضروری ہے۔لیکن ایک اور دشواری کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ

> ایک محقق دوسرے محقق کے کام کو رد بھی کرتا ہے۔دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہوتے ہیں۔یہاں مورخ کا کام ہے کہ وہ اپنی بصیرت،قوت تحلیل اور علمی وژن کو کام میں لائے اور کسی آخری فیصلے پر پہنچ جائے یا پھر بہ صورت دیگر متنازعہ امور کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والا اپنی بصیرت کو متحرک رکھ سکے اور کسی نتیجے پر مرتکز ہو سکے۔ (42)

ایک اور اہم نکتہکی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ تاریخ ادب میں کسی فن کار کی سوانح کا کتنا حصہ ہونا چاہیے اور اس کے فن کاروں پر کس قدر گفتگو ہونی چاہیے۔وہ نہیں چاہتے کہ کسی فن کار کے احوال زندگی تفصیلات کی نذر ہو جائے اور اس کے فن پر مناسب گفتگو نہ ہو۔یہ بھی مناسب نہیں کہ اس کی زندگی پر گفتگو تشنہ رہ جائے اور اس کے فن پر سیر حاصل بحث کی جائے۔وہاب اشرفی معیانہ روی کے قائل ہے۔وہ لکھتے ہیں

> دراصل گفتگو تناسب کی ہونی چاہیے کہ زندگی کے غائق اتنے طویل نہ ہو جائے کہ فن اور فکر پر گفتگو سرسری ہو جائے۔سوانح اور فکر وفن کے مباحث میں خوشگوار،ہم آہنگی اور تناسب کا اپنا حسن ہے جسے ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ویسے اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا جانتا ہے کہ سوانحی اشارات کا اصول بھی آسان نہیں ہے۔ہمارے یہاں اب تک ادبی ڈکشنریاں یا متعلقہ معاون کتابیں بے حد کامیاب ہیں ان کا یکجا اصول آج بھی کار مشکل ہے۔(43)

وہاب اشرفی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مورخ ادب کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے کیوں کہ ذرا سی غفلت اس کے کاموں پر پانی پھیر سکتی ہے۔انھوں نے ایک عبرت ناک مثال علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے نامکمل پروجکٹ کی دی ہے۔جس کی پہلی جلد اغلاط کا پشتانہ ثابت ہوئی اور وہ واپس لے لی گئی ۔ اگرچہ اس میں بہت سے اہم نکات موجود ہیں۔پروفیسر وہاب اشرفی یہ چاہتے ہیں کہ مورخ کو سوانح امور میں کچھ زیادہ ہی چوکنّا رہنا

چاہیے۔ایک اور مسئلے پر بھی انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ اہم اور نامور شعرا اور ادبا کے ساتھ دور حاضر کے لکھنے والوں کی شمولیت کس حد تک ہونی چاہیے۔ یا پھر مورخ کو ایسے فراموش شدہ ناموں کی تجدید سے غائق نہیں ہونا چاہیے جنھیں مناسب جگہ نہیں ملی اس لیے یہ کام ادبی مورخ کا ہوتا ہے کہ وہ بعض فراموش شدہ فن کاروں کی تلاش کریں اور تعصب کے شکار ہوئے بغیر مورخ اگر ذاتی تعصب سے بالاتر نہیں ہوتا تو وہ تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔مغرب میں جو تاریخیں لکھی جارہی ہیں وہ بڑی حد تک تازہ ترین ہوتی ہیں یہ بات اردو ادب کو میسر نہیں ۔مغرب میں وہ اپنے ہم عصر لکھنے والوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے پس و پیش نہیں کرتے لیکن اردو میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اپنے عہد کے لکھنے والوں سے صرف نظر کیا گیا ہے۔وہاب اشرفی چاہتے ہیں کہ اس رویے میں تبدیلی ہونی چاہیے۔مورخ ادب کو کسی سے متاثر یا مرغوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر معاصرین کو تاریخ ادب میں جگہ دیں خاص کر ان لکھنے والوں کو جگہ دیں جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کی ایک اور مسئلے کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی ہے وہ دبستانوں کا مسئلہ ہے۔بعض تسلیم شدہ دبستان جیسے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ بہت کم اختلافی پہلو رکھتے ہیں لیکن جہاں تک دبستان رام پور یا دبستان عظیم آباد کا تعلق ہے یہاں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔علی جواد زیدی نے دو ادبی اسکول لکھ کر لکھنو اور دہلی دبستانوں کا خز یہ پاک کرنے کی سعی کی ہے۔ اور یہ ضروری بھی نہیں کہ کسی فن کار پر جب گفتگو ہو تو اس پر کسی دبستان سے وابستہ کر کے ہی دیکھا جائے کیونکہ وقت،حالات،کوائف اور کلچرل لین دینسے جامد تصوّرات پارہ پارہ ہوجاتے ہیں۔ضروری نہیں کہ لکھنؤ کے ہر شاعر کو ایک ہی پیمانے سے ناپا جائے کچھ الجھانات ومیلانات اپنے اختساس کی وجہ سے اسکول یا نظریے کی شکل اختیار کر

لیتے ہیں لیکن ان کو سب کچھ سمجھ لینا کسی فن کار کی نفرادیت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ وہاب اشرفی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے تاریخ ادب بہت ہی کھلے ذہن کے ساتھ لکھی ہے۔ اور ان کی تمنّا رہی کہ یا عصری ادب کی بھی بھرپور نمائندگی ہو۔ انھوں نے شائع شدہ چھوٹی بڑی اردو ادب کی تاریخوں پر گہری نظر رکھی اور اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اور کسی حد تک حاشیے میں یا متن میں تفصیل بھی دے دی ہے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ بعض زندہ ادیبوں کا سوانحی حصہ کمزور ہے۔ اس کے اسباب پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ادباء و شعراء اور دوسرے قلم کاروں کی ترتیب میں تاریخ پیدائش کا خیال رکھا ہے اور کسی فن کار کی عظمت کا لحاظ کیے بغیر متعین کی گئی ہے۔ ان کے بیانات کی روشنی میں جب ہم تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیتے ہیں تو جگہ جگہ دقت کا سامنا کرنا پڑھتا ہے۔ پہلے حصے کو انھوں نے 22 ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ دوسرا باب "ابتداء سے 17 ویں صدی عیسوی کا ادب" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ پھر دکنیات اور اردو ادب، گجری ادب، بہمنی ادب، عادل شاہی ادب، قطب شاہی ادب، دو ادبی دبستان، اٹھارہویں صدی عیسوی کا ادب، ایہام گوئی کی روایت، ایہام گوئی کے خلاف ردعمل، زٹلی، ولیؔ اور سراجؔ، سوداؔ، میرؔ اور دوسرے شعراء، انّیسویں صدی کا ادب، غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ اور دیگر شعراء۔ مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء، فورٹ ولیم کالج، سرسید اور ان کا عہد، دلی کالج، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تحقیق و تنقید، انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ممتاز ڈراما نگار، انّیسویں صدی اور بیسویں صدی میں طنز و مزاح۔ یہ پہلی جلد کا خاکہ ہے۔ اس کے مطالعے سے جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی ترتیب بڑی روا روی میں ہوئی ہے، جو مؤلف کو اس کے نظرِ ثانی کا موقع شاید میسّر نہیں آیا ورنہ بہت سی اغلاط اس میں راہ نہ

پاتی۔انیسویں صدی کا سیاسی منظرنامہ تو پیش کیا لیکن اس کے نیچے ذوقؔ،ظفرؔ اور دیگر شعراء کے ساتھ بیسویں صدی کے شعراء کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انیسویں صدی کے ادب کے ساتھ بیسویں صدی کے سیاسی منظرنامہ بھی پیش کیا جاتا۔سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ سرسید اور ان کے عہد میں عبدالقادر سروری کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔عبدالقادر سروری مشہور و معروف محقق اور نقاد ہیں اور بہت سی کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں ان کی تاریخ پیدائش 1860ء بتائی گئی ہے جو کسی طرح درست نہیں۔اسی میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ 1929ء میں انھوں نے ایل۔ایل۔بی کیا۔1927ء میں ایم۔اے اردو میں کیا،وہ زور کے ہم جماعت تھے اور سلیم پانی پتی کی سفارش پر انھیں لکچرر شپ ملی۔انھیں 1942 میں میسور یونیورسٹی میں پروفیسری ملی اور شعبہ کی صدارت بھی۔اگر ان کی تاریخ پیدائش 1860ء کو صحیح مان لیا جائے تو جس وقت وہ میسور یونیورسٹی کے مہاراجاس کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنا جائزہ لیا ہے ان کی عمر 82 سال ہوجاتی ہے۔ظاہر ہے کہ سرسید کے انتقال کے بہت بعد وہ پیدا ہوئے ہیں اور وہ ڈاکٹر زور کے معاصرین میں ہیں۔ان کا کسی بھی طرح سرسید کے رفقا میں یا سرسید کے عہد میں نہیں ہونا چاہیے۔غالباً ان کی پیدائش کو بنیاد بنا کر ان کا شمار عہد سرسید میں کردیا گیا ہے، جو ایک بہت ہی فاحش غلطی ہے۔

یہاں ایک اور اہم نقطہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ اشرفی صاحب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے ترتیب کے دوران پیدائش کا خیال رکھا ہے۔اگر سنہ پیدائشی ہی کو بنیاد بنا کر مصنفین کی ترتیب دی گئی ہے تو اس کا خیال بھی رکھنا چاہیے، کیونکہ غالبؔ کا ذکر ذوقؔ سے پہلے آیا ہے ذوقؔ کی تاریخ پیدائش 1788ء ہے جبکہ غالبؔ کی پیدائش 1789 ہے۔بہادر شاہ ظفر کی تاریخ پیدائش 1775ء ہے لیکن یہاں غالب،غالب کے بعد ذوقؔ،ذوقؔ

کے بعد ظفرؔ کا تذکرہ ہوا ہے۔اسی طرح آپ دیکھیں گے سفیؔ کا تذکرہ سرور جہاں آبادی سے پہلے ہونا چاہیے تھا لیکن صفیؔ کا تذکرہ سرور جہاں آبادی کے بعد کیا گیا ہے۔ بہت سے شعرا کی تاریخ وفات نہیں دی گئ ہے، جیسے خواجہ وزیر، اسد علی خلق، میروزیر علی صباح، مستر خیر آبادی، محمد خان برق، غلام امام شہید، علیا وسط اشک، تاریخ پیدائش نہیں دی گئی ہو پھر شمولیت کی ترتیب کس طرح دی گئی ہے ، یہ بات مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے۔اور یہ سوانحی حصہ یوں بھی کمزور ہے کہ ایک جمیلہ خدا بخش کا بھی ذکر کیا گیا ہے ان کی شاعری کی تعریف کی گئی ہے، ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار کیا گیا ہے

جمیلہ جس طرح کی شاعری کرتی ہیں وہ معمولی درجے کی شاعری نہیں لہٰذا اساتذہ نے ان کی خاصی مدد کی ہوگی ۔ یہ گمان اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنا شعر ہی سمجھ نہ پائی اور اس کی تعبیرات کے لیے دوسروں سے رجوع کرتی رہی ۔ پھر ایک الجھن یہ ہے کہ وہ خدا بخش خاں خود شاعر تھے کتابیں جمع کرنے کے علاوہ شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی ۔لیکن نہ تو کہیں ان کا کوئی کلام ملتا ہے نہ ہی اس کا کوئی مخطوطا لائبریری میں موجود ہے۔ ایسا تو نہیں کہ موسوف نے اپنا کلام بھی اپنے چہیتی بیوی کے کلام میں ضم کر دیا ہو یہ بھی ایک معمہ ہے کہ قاضی عبدالودود جیسے محقق نے جمیلہ پر کچھ نہیں لکھا وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔

جب جمیلہ خدا بخش کا کلام شک وشبہ سے بالاتر نہ ہوتو چاہیے تھا کہ انھیں شامل ہی نہ کیا جاتا۔شامل کرنا پھر شبہ کا اظہار کرنا قاری کو الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مولانا ظفر علی خان کی پیدائش کی دو تاریخیں درج کی گئی ہیں ایک 1872ء اور 1870ء۔ پڑھنے والا اور بھی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کس تاریخ کو درست سمجھے۔ظفر علی خان کی سوانح بہت سی اختصار کے ساتھ لکھی گئ ہے۔اور ان کے جو اخبار نے صحافت کا جو معیار بلند کیا

تھا،عوام میں بیداری کی جو لہر پیدا کی تھی اوران کی وہ نظمیں جو احتجاجی شکل اختیار کر دی ہے جن میں عہد حاضر کے موضوعات کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ظفرعلی خان کے اخبار سے بڑے بڑے صحافی وابستہ تھے ان کے دفتاروں میں کام کرنے والوں میں غلام رسول مہر بھی تھے اور عبدالمجید سالک بھی تھے۔لہٰذا ضرورت تھی کہ ان تمام کا ذکر کیا جاتا کیونکہ ان صحافیوں کو بڑھاوا دینے میں ظفرعلی خان کا اہم حصہ ہے۔ظفرعلی خان زبان وبیان پر بہت عبور رکھتے تھے ان کا کلام اس دور کا آئینہ ہے اگرچہ اس میں بہت سی نظمیں سیاسی اورسماجی موضوعات پر ہیں لیکن یہ نظمیں ادبی لطف سے محروم نہیں ہیں۔کہیں بھی ان کے شعری مجموعے کے نام بھی نہیں لکھے گئے ہیں۔چاہیے تھا کہ ان کے شعری مجموعے کا نام بھی شامل کیے جاتے اوران کی طنزیہ شاعری پر کھل کر گفتگو ہوتی۔

یہاں ایک اورشاعر کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے وہ عبدالمجید سالک ہیں۔عبد المجید سالک کا شمار بھی عہد سرسید کے لکھنے والوں میں کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ بہت ہی جونیر Junior ہیں اورکسی بھی طرح ان کا شمار عہد سرسید میں نہیں کرنا چاہیے ان کی تاریخ پیدائش 1845 بتائی گئی ہے یہ صحیح نہیں ہے ان کی تاریخ پیدائش 1895ء ہے۔جدید شعرائے اردو میں یہ تاریخ درج ہے۔ غلطی سے لکھ بھی دیا گیا ہے کہ 1920ء سے 1927ء تک سالک زمیندار (میگزین) کے ایڈیٹر تھے۔یہ بات درست نہیں ہے سالک زمیدار کے ادارے سے وابستہ تھے ایڈیٹر تو ظفرعلی خان ہی تھے۔یہ بھی لکھا ہے کہ 1927ء میں انھوں نے روزنامہ انقلاب کا اجرا کیا تھا جب سالک اور غلام رسول مہر زمیندار لاہور سے علٰحیدہ ہو گئے تب دونوں نے مل کر ایک روزنامہ جاری کیا تھا اس کا نام انقلاب تھا۔

تاریخ ادب اردو کا پانچواں ، چھٹا اور ساتواں باب دکنی ادب سے متعلق ہے۔

وہاب اشرفی نے چونکہ اس سے قبل وجہی کی مثنوی قطب مشتری کی تدوین بھی کی ہے اور اس پر ایک گراں قدر مقدمہ بھی لکھا ہے ان سے یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ دکنی ادب کا جائزہ مفصل طور پر لیں گے۔ ہماری ادبی تاریخ کی جڑیں عہد ماضی میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دکنی ادب سے مراد وہ ادبی سرمایہ ہے جو تقریباً چھ سو سال سے گجرات اور دکن کے مختلف علاقوں میں ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا اور شمالی ہند پہنچا۔ ولیؔ دکن کے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے 1700ء کے لگ بھگ شمالی ہند کا سفر کیا۔ ولیؔ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام سے شمالی ہند کے شعراء کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ شمالی ہند میں اردو شعر گوئی کی رفتار ولیؔ کے بعد ہی تیز تر ہوئی اور شمالی ہند کے فارسی گو شعراء ولیؔ کی تقلید میں اردو میں شعر کہنے لگے۔ دکن میں جو سرمایہ ملتا ہے وہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ یہاں کہ صوفیائے کرام کی خدمات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ صوفیائے کرام کے بعد سلاطین کی سرپرستی اور قدر افزائی نے اس زبان کے فروغ میں اہم حصہ ادا کیا۔ بیشتر سلاطین خود شاعر گزرے ہیں۔ گولکونڈا کے پانچواں فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔

قلی قطب شاہ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہاب اشرفی لکھتے ہیں

> اس کی شاعری میں مشترکہ کلچر کی جو خصوصیت نمایاں ہے اس کا احساس سبھوں نے کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی تہذیب کا ایک ایسا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے جس کے یہاں ہندوستانی رنگ بہت تیز ہے۔ طرز ادا اور بیان میں وہ کبھی بھی اپنی مٹی کو نہیں بھولتا، تشبیہ و استعارے میں اپنی مٹی کی خوبو پیدا کرتا ہے۔ لہذا ہندی کی چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے۔(44)

اس کتاب میں دکن کے اہم شعراء کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو کے حصہ اول میں دکنی ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نہیں معلوم وہاب اشرفی صاحب نے دکن کے بلند مرتبت اور اہم شعراء کو اپنی تاریخ میں کیوں جگہ نہیں

دی۔صاحب دیوان شعراء کا نام بھی اس تاریخ میں نہیں ملتا۔تاریخی اعتبار سے حضرت بندہ نواز گیسودراز کا تذکرہ، کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف نظامی بیدری سے بہت پہلے ہونا چاہیےلیکن کن مصلحتوں کی بنا پرنہیں معلوم انھوں نے نظامی کا تذکرہ بندہ نواز گیسودراز سے پہلے کیا ہے۔بہمنی عہد کا ایک اہم شاعر قریشی بیدری ہے جس کی مثنوی بھوگ بل ملتی ہے۔اور بہمنی عہد ہی کا ایک اور شاعر فیروز بیدری ہے جس کی مثنوی کا نام" پرت نامہ" ہے جسے مسعود حسین خان نے مرتب کیا ہے۔عادل شاہی عہد کے شعرا میں نصرتی کی شمولیت نہیں ہونا تعجب کی بات ہے۔نصرتی نہ صرف عادل شاہی عہد کا بلکہ دکنی ادب کا بہت بڑا شاعر ہے۔وہ بلا شبہ ایک زبردست مثنوی نگار قصیدہ نگاراور رباعی نگار ہے۔نصرتی میدان سخنوری میں قلم سے تلوار کا کام لیتا ہے۔وہ رزم اور بزم دونوں میدانوں کا شہہ سوار ہے۔بقول عبدالمجید صدیقی

> نصرتی جو بات بیان کرتا ہے وہ شگفتہ انداز میں اور دلچسپ مثالوں کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ دل میں اتر جاتی ہے جو منظر پیش کرتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے تصویر بن جاتا ہے۔بزم کا بیان کرتا ہےتو ایسے الفاظ میں کہ اس کا سماں بن جاتا ہے اور رزم کا بیان کرتا ہے تو اس دلکش پیرائے میں کہ دلوں میں ارتعاش ہونے لگتا ہے۔(45)

نصرتی ایک پر گو اور قادرالکلام شاعر تھا ۔صاحب بساتین السلاطین میں نصرتی کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز بادشاہ محل میں رونق افروز تھا اور حوض میں فوارہ عجیب بہار دے رہا تھا۔بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرع نکلا نصرتی نے فوراً گرہ لگائی۔نصرتی ہر صنف میں یکساں عبور رکھتے ہیں۔اس کی تین مثنویاں ملتی ہیں۔پہلی گلشن عشق جو 1068 ھ میں لکھی گئی اس کو مولوی عبدالحق اور پروفیسر سید محمد نے اپنے اپنے مقدموں کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا ہے۔اس کی دوسری مثنوی علی نامہ ہے جس کا سنہ تصنیف 1067 ھ ہے۔جسے عبدالمجید صدیقی نے مرتب کیا ہے یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ایک اور مثنوی تاریخ اسکندری جو

1083ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ نصرتی کی رزمیہ مثنوی علی نامہ کا ذکر دکنی ادب میں ناگزیر ہے۔ یہ ایک شاہکار مثنوی ہے اس کو بلاخوف تردید دکنی ادب کا شاہ نامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی میں عادل شاہ ثانی کے عہد کے سیاسی واقعات کی تفصیل ملتی ہے۔ مختلف لڑائیوں اور فتوحات کا بیان اس سلسلے کی کڑیاں سات قصائد ہیں جو اس مثنوی میں شامل ہیں۔ کئی قصیدوں میں اس نے واقعات جنگ، دشمن کی شکست ، بادشاہ کے ہاتھی، گوڑے اور تلوار کی تعریف، شہر، باغ اور محل کی آرائش، قلعوں کی بلندی فتح کے جشن کا نقشہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچا ہے۔ نصرتی نے اس عہد کی تاریخ کو بڑی ہی عمدگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس مثنوی میں مار وقتل کا زور وشور ہتھیاروں کے یلغاریں ہی نہیں بلکہ اس میں شاہی دربار کے شان وشوکت بادشاہ کا جاہ وجلال، بادشاہ کی ہر دل عزیزی، رعایا کی محبت، سپہ سالاروں کے کارہائے نمایاں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ علی نامہ صرف لڑائیوں کی داستان ہی نہیں دکنی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا مرقع بھی ہے۔ شاعر نے حقیقت نگاری اور کردار نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ نصرتی کے قصیدے اس قدر بہتر اور شاندار ہیں کہ ان قصیدوں کو پڑھتے ہوئے فارسی کے قصیدوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ نصرتی نے علی نامہ شاعرانہ حسن کے ساتھ بیان کیا ہے کہ زبان کی قدامت کے باوجود طبیعت پڑھنے سے نہیں اکتاتی ہے۔ نصرتی کو واقعہ نگاری میں بڑا کمال حاصل ہے۔ وہ میدان جنگ کے مختلف واقعات کو اس طرح منظوم کرتا ہے جس طرح وہ واقعہ ہمارے آنکھوں کے سامنے ہوئے ہوں۔ علی نامہ بیجاپور کی پندرہ سالہ تاریخ کی منظوم داستان اور دکنی ادب وتہذیب کا دلکش مرقع ہے۔
عادل شاہی عہد کے شعراء میں رستمی بیجاپوری بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کمال خان رستمی نے ابن حسام کی ضخیم فارسی مثنوی خاور نامہ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس مثنوی میں 22061 اشعار

ملتے ہیں۔ یہ ترجمہ اس نے خدیجہ سلطان کی فرمائش پر کیا اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس نے تقریباً ہر بیت کا ترجمہ کیا اس مثنوی میں وہ دوسو بائیس عنوانات قائم کیے گیے ہیں اس کا کمال یہ ہے کہ یہ ترجمہ اس نے ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کیا ۔ یہ ترجمہ 1050ھ میں پائے تکمیل کو پہنچا۔نصیرالدین ہاشمی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

> اگرچہ رستمی نے اس داستان کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے لیکن اس کو ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ رستمی نے اس کو بالکل اپنا لیا ہے۔ خاور نامہ اردو کی پہلی ضخیم رزمیہ مثنوی ہے۔ ضخیم ہونے کے باوجود اس میں قصے کا تسلسل اور ربط قائم ہے۔ اگرچہ مثنوی فارسی کا ترجمہ ہے لیکن اس سے عادل شاہی تمدن اور تہذیب کا پتا بھی چلتا ہے۔(46)

خاور نامہ میں مذہبی جذبہ، جذبہ جہاد کو ابھارا گیا ہے اس طویل مثنوی میں مترجم نے آخر تک دلچسپی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ بڑا اچھا اور زوردار ہے۔ بقول ڈاکٹر زور

> اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ ان مثنویوں میں سے ہیں جو سادہ اور سلیس ہیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں لکھی گئی۔(47)

اس میں ملک خوشنود کا بھی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ملک خوشنود ایک اچھا غزل گو، قصیدہ نگار اور مثنوی نگار رہے اس نے محمد علی شاہ کی فرمائش پر امیر خسرو کی یوسف زلیخا اور ہشت بہشت کو دکنی اردو میں منتقل کیا ۔ یوسف زلیخا ناپید ہے۔ البتہ جنت سنگار بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ہشت بہشت کا آزاد ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہہ پارے میں خوشنود کی ایک مثنوی" بازار حسن" کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ڈاکٹر زور نے جنت سنگار کے ایک ناقص مخطوطے کے ایک شعر کو دیکھ کر اس مثنوی کا نام" بازار حسن" لکھ دیا ہے۔

حالانکہ خوشنود نے اس مثنوی کا نام جنت سنگار ہی لکھا ہے۔ جنت سنگار 1050ھ میں مکمل ہوئی۔

اس میں محمد علی شاہ کے ایک بزرگ شاہ ابوالحسن قادری کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ جنہوں نے اپنی مثنوی شکنجن میں ایک طفلانہ بازی کے ذریعے تصوف وحکمت کے نکات کی تشریح کی ہے ان کو سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے کھیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حتی کہ اس میں ابراہیم جگت گرو کا تذکرہ بھی نہیں ہے۔ ابراہیم ہی کا دور نہایت اہم دور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دور میں علم وفن کی بہت سرپرستی ہوتی ہے اس کے دور سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے دور کو عادل شاہی عہد کا عہد زرّین کہا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھا اسے خطاطی ،مصوری میں کمال حاصل تھا موسیقیت سے بڑی رغبت تھی۔ اس نے نو باد شہر نورس پور کا ایک محلہ موسیقی دانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ کتاب نورس سے اس کے ذوق شاعری اور ذوق موسیقی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا مقدمہ ملا ظہوری نے فارسی میں لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب نورس میں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

> گیتوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان گیتوں میں حسن جمال کی رعنائیاں تخیل کی سحر انگیز رنگوں ،عشق کی دبی دبی آگ پر اثر تشبیہات ،ہجر ووصال کے رنگا رنگ کیفیات کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔

(48)

اس کتاب نورس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابراہیم نہ صرف دکنی بلکہ سنسکرت ، برج بھاشا اور سب سے بڑھ کر ہندو دیو مالا پر پوری طرح عبور رکھتا تھا۔

اس میں ظہوری جس نے مثنوی پند نامہ لکھی محمود خوشدہاں جس نے رسالہ خوشدہاں اور کشف الوجود لکھی اور ایاتیٓ جس کی مشہور مثنوی نجات نامہ ہے اس کا بھی تذکرہ نہیں ملتا۔

ابراہیم عہد کے دو اہم شعراء محمود اور خیالی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس دور کے ایک شاعر فیروز کو فیروز شاہ بہمنی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اگر چہ فیروز شاہ بہمنی اور قطب الدین قادری فیروز دو علیحدہ شخصیتیں ہیں۔ فیروز شاہ بہمنی نے دکنی میں کبھی طبع آزمائی نہیں۔

محمد قلی قطب شاہ دکن کا پانچواں بادشاہ ہے اور کئی اعتبار سے اس کا عہد امتیاز رکھتا ہے۔ اس کا عہد بڑی حد تک امن و امان میں گزرا۔ اس کے عہد میں ادبی سرگرمیاں، علمی کاوشیں ،فنی اور تخلیقی کارنامے انجام پائے۔ اس وجہ سے اس کا عہد ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ قلی قطب شاہ نہ صرف رعایا پرور بادشاہ تھا بلکہ وہ حیدر آباد جیسے خوش نما شہر کا بانی بھی تھا۔ وہ اردو، تلگو اور فارسی میں طبع آزمائی بھی کرتا تھا۔ تہذیبی اور سماجی نقطہ نظر سے ان کا عہد حکومت قطب شاہی عہد کا زریں باب ہے۔ اسکے عہد میں مملکت میں بسنے والے مختلف فرقوں اور گروہوں کے مابین یگانگت اور میل جول کے جذبات نشو ونما پاتے رہے۔ اس نے عید الفطر، بقر عید اور محرم کے ساتھ ساتھ بسنت ،نوروز جیسے تہواروں کو بھی قوم کی اجتماعی مسرت کا آئینہ دار بنا دیا۔ قلی قطب شاہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے ہاں مختلف اصناف سخن کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ چار سو سال پہلے لکھی ہوئی نظمیں ہندوستان کے تہذیبی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ قلی قطب شاہ کی تاریخ پیدائش 566 ھ بتائی گئی ہے اگر چہ اس کی پیدائش 4 اپریل 1565ء ہے۔ قلی قطب شاہ ،قطب شاہی عہد کا پانچواں بادشاہ ہے لیکن اسے چوتھا بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کے کلام کو ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا دوبارہ اس کی کلیات کو سیدہ جعفر نے بھی مرتب کیا ہے۔ قطب شاہی عہد کے شعراء میں فائز گولکونڈوی، جنیدی، مصنف ماہ پیکر، میراں جی خدا نما، عابد شاہ ، میراں یعقوب کا بھی تذکرہ ضروری تھا لیکن روا روی میں وہاب اشرفی نے اہم شعراء سے صرف نظر کیا ہے۔ اسے دکنی ادب کے ارتقائی مراحل

کا، زبان کس طرح تیز رفتاری سے تبدیلیوں سے آشنا ہوتی جا رہی تھی کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بعد دو ادبی اسکول کے عنوان سے دہلی اور لکھنو کے دبستانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایہام گو شعراء اور رد عمل کے شعراء کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد زٹلی، وؔلی اور سراج کی سرخی کے تحت مذکورہ شعراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حالانکہ فاضل مورخ کو چاہیے تھا کہ ولؔی کا تذکرہ ان سب سے پہلے کر دے کیونکہ ایہام گو اور رد عمل کے شعراء کا تعلق ہے انھوں نے ولی ہی کی تقلید میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ ولؔی اور سراؔج کے عہد کے دیگر شعراء جیسے عاجزؔ، امتیازؔ، فدوؔی، باقرؔ، آگاہ، ولؔی ویلوری، قربؔی یہ ایسے شعراء ہیں جنھیں تاریخ ادب میں جگہ ملنی چاہیے۔ یہ بھی ڈاکٹر وہاب اشرفی کی ایک بڑی فروگزاشت ہے۔

بعض شعراء کے بارے میں جو رائے وہاب اشرفی نے دی ہے وہ بے حد سرسری ہیں جس سے ان شعراء کے بارے میں کوئی خاص رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ جیسے جلیل مانک پوری کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے کہ

> معرفت سے ان کا کلام خالی نہیں لیکن اس زمانے میں جو لکھنؤ کا مزاج تھا، خصوصاً عورتوں کے سلسلے میں وہ ان کے یہاں بھی ملتا ہے۔ یعنی رسم مضامین۔ بعضوں نے اس پر اسرار کیا ہے کہ جلیل کی زبان ناسخ کے مقابلے میں صاف اور رواں ہے لیکن یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔" (49)

جلیل کی سوانح بھی بہت سرسری طور پر دیے گئے ہیں۔ چاہیے تھا کہ جلیل جیسے استاد کے تعلق سے تفصیلاً حالات پیش کیے جاتے۔ اس میں نہ جلیل کے شعری مجموعوں کا ذکر ہے نہ جلیل کے دربار سے وابستہ ہونے کے بارے میں کچھ تفصیل ہے۔ جلیل کے جو اشعار دیے گئے ہیں ان میں بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جلیل نواب عثمان علی خان کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر دربار بھی تھے۔ پہلے نواب فصاحت جنگ بہادر کا خطا کیا۔ امام الفن کے لقب

سے ان کی مزید عزّت افزائی فرمائی۔ جلیل صرف شاعر ہی نہیں، ان کی علمی اور ادبی خدمات بھی لائق توجہ ہے۔ انھوں نے 1918 میں تذکیر و تانیث کے موضوع پر ایک نہایت ہی عمدہ اور ضخیم کتاب لکھی۔ جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث مثال کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امیر مینائی کے زندگی کے حالات بھی ایک کتابی شکل میں پیش کیے۔ جو 1927ء میں شائع ہوئی۔ جلیل امیر مینائی کے شاگرد خاص اور جانشین تھے۔ اردو شاعری میں اپنے استاد کے رنگ کے حقیقی امانت دار تھے۔ وہ امیرؔ کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہیں انہی کے رنگ میں شعر کہنا انھیں مرغوب آتا ہے۔ وہی شوخی وہی سادگی جو ان کے استاد کے کلام کا طرّہ امتیاز ہے ان کے یہاں سلیس اور عام فہم انداز میں کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ ان کی غزلیں بے حد دلکش ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام کی مقبولیت میں دکن میں اردو زبان کا جو ذوق عوام میں پیدا کیا، وہ نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جلیل بنیادی طور پر خالص لکھنوی شاعر تھے۔ وہ قدیم سلسلہ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کے آخری نمائندہ شاعر تھے تاہم انھوں نے اپنی ذات میں اور اپنی شاعری میں انّیسویں صدی کے آخر دبستان دلی اور دبستانِ لکھنو کی شاعری کی خصوصیات یکجا کر لی تھیں اس رنگ تغزل کو دہلی اور لکھنوی اسکول کا سنگم قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے بجا طور پر کہا ہے کہ شاعری میں جلیل نے دہلوی اور لکھنو کے رنگوں کو سمویا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دبستان لکھنؤ کے لطیف ارتعاشات ان کی شاعری میں توازن کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ دبستان دلّی کی مخصوص داخلیت بھی ان کی شاعری میں سمٹ آئی ہے ۔ان دونوں دبستانوں کی قدامت نے جلیل کی شاعری میں نکھار پایا ہے۔ اختر الایمان کا خیال ہے کہ جلیل داغ کے اسکول کے کم و بیش

آخری شاعر ہیں جنہوں نے اپنے سوا اپنے استاد امیر مینائی کو مزید شہرت دی اور ان کی روایت کو زندہ رکھا۔ثریا حسین ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: جلیل کے ترنم اظہار نے ہجرو سوز کی بہ نسبت وصل ونشاط کی کیفیت نمایاں ہے۔ وہ اس رنگ کے دوسرے اساتذہ سخن مثلاً مؤمنؔ، داغؔ کے مقابلے میں زیادہ ضبط اور تہذیبِ حسن سے کام لیتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کا کہنا ہے ابتدا میں جلیل اپنے استاد کے ساتھ رام پور میں رہے۔ پھر وہ حیدر آباد چلے گئے۔اس لیے ان کی شاعری درباری شاعری کے اثر سے کبھی علیحدہ نہ ہو سکی۔ پروفیسر مسعود حسین خان کا خیال ہے کہ جلیلؔ کی عمر کا بیشتر حصہ خسروانِ دکن کے دربار میں گزرا لیکن یہ امر لائق تحسین ہے کہ انہیں دربار یا درباراداری نے بگاڑا نہیں بلکہ ان کی موجودگی میں دربار کا مذاق سخن بلند ہو گیا۔انھوں نے اہل دکن کو نہ صرف اردو زبان کا محاورہ اور روزمرّہ سکھایا بلکہ معاملات حسن وعشق کی تہذیب بھی کی۔جلیل کی ہر دل عزیزی کے تین بڑے اسباب ہیں۔ پہلا سادگی بیان، صفائِ زبان کے ساتھ نازک خیالی اور بلند پروازی ان کے کلام میں جمع ہو گئی تھی، جس سے ان کے کلام کا پایہ بہت بلند ہو گیا۔ دوم جلیلؔ اپنی غزلوں میں الفاظ کی ماہرانہ نشست سے ترنم کا ایسا جادو جگاتے ہیں گویا ان کی تخلیق موسیقی ہی کے لیے کی گئی ہے۔سوم بیانِ حسن وعشق میں روزمرّہ اور سلاست کی بدولت ایک عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے جو پڑھنے والوں کے دل کو موہ لیتی ہے۔ان کے کلام میں رعایت لفظی اور محاورہ بندی بھی ہے تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔جلیلؔ کے کلام میں اخلاقی وصوفیانہ مضامین بھی ملتی ہے۔ان کا اصل رنگ حسن وعشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔لیکن اس میں بھی متانت، خوش مذاقی اور بلند خیالی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔جلیل کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔جس میں لطف زبان سے نکھار اور زیور محاورہ سے مزید دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ انداز بیان کی اسی جادوگری نے

باوجود یہ کہ وہ قدیم دبستان غزل کے شاعر ہیں ان کے موضوعات اردو شاعری کے عام موضوعات ہیں۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا تاج پہنایا ہے۔ جلیل کے تین شعری مجموعے ہیں تاجِ سخن، جان سخن اور معراج سخن۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہو

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
توبہ کر کے توڑ ڈالی جائے گی

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

جلیلؔ کی نعتیں بھی بہت اہم ہیں۔ جلیل نے جو قصیدے لکھے وہ اپنی جگہ بے حد اہم ہیں۔ اور جلیلؔ کو فن تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ جب میر عثمان علی خان تخت نشین ہوئے تو جلیلؔ نے جو قصیدہ لکھا وہ اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں جو تاریخی قطع ہے جس میں صنعت تعمیہ کا استعمال ہوا ہے اس کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ شاہ کے ساتویں میں بادشاہ ہونے

کی رعایت سے سات اشعار انھوں نے کہے اور آخری شعر میں جو تخرجہ کیا ہے وہ بے حد لاجواب ہے۔آخری مصرع سے 1917 برآمد ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تخت نشینی 1911ء میں ہوئی تھی پہلے مصرع میں تخرج کی طرف اشارہ اس کو دل سے کیا ہے کہ گمان ہی نہیں گزرتا کہ تخرجہ ہوا ہے ۔مصرع تاریخ الفاظ اور مضمون کے لحاظ سے بے حد برجستہ اور رواں ہے۔ ان کے قصیدے ایک انوکھی شان رکھتے ہیں۔اور انھوں نے کثرت کے ساتھ شاہی تقاریر پر منظومات کہیں۔اور جلیل ایک استادفن تھے ان کا تفصیلی جائزہ مورخ ادب کے لیے ضروری تھا۔

تاریخ ادب اردو: سیدہ جعفر

پروفیسر سیدہ جعفر ایک ممتاز محقق ہیں۔انھوں نے بہت سی کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے۔جن میں احمد گجراتی کی یوسف زلیخا،کلیات قلی قطب شاہ بے حد اہم ہیں۔"اردو میں مضمون کا ارتقاء" ان کا تحقیقی مقالہ ہے،جس پر پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری اوارڈ ہوئی تھی۔ دکن میں رباعی ایک اہم اور گراں قدر کام ہے۔جس میں انھوں نے متعدد دکنی شعراء کی رباعیوں کو منظرعام پر لاکر ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے، جو بہت ہی کارآمد ہے۔تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک جلد اول میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی کی جانب سے"تاریخ ادب اردو ستر ہویں صدی تک" 1998ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب پروفیسر گیان چند جین اور سیدہ جعفر دونوں کا اشتراک کا نتیجہ تھی۔ یہ پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔کیونکہ اردو میں تاریخ ادب پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد کم ہے،اس لئے سیدہ جعفر نے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے ہر باب کی ابتداء میں

اس عہد کے تہذیبی و ادبی محرکات کا جائزہ لیا۔ نیز یہ کوشش کی ہے جن شخصیتوں کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہے، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور مختلف مآخذوں سے اکھٹا کیے معلومات اس طرح پیش کیے جس سے فن کار کے متعلق ہماری آگہی میں اضافہ ہو۔ اس کتاب کا خاکہ وہی ہے جو سید اعجاز حسین کی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' کی ہے۔ شعراء کی مختلف ادوار، نثر، سرسید اوران کے معاصرین، مضمون نگاری، صحافتی خدمات، تنقید، طنز و مزاح، ناول یعنی تقریباً کچھ ناموں کے حذف اور اضافے کے ساتھ انھوں نے اسی خاکے کو اپنایا جو ہمیں سید اعجاز حسین کے ہاں نظر آتا ہے۔ سیدہ جعفر نے نہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی نہ اس تاریخ لکھنے سے ان کا کوئی خاص مطمع نظر سامنے آتا ہے۔ آخری باب میں، جس کا عنوان ترقی پسند شعراء اوران کے ہم عصر سخن ور ہے اس میں تقریباً 24 شعراء کو شامل کیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ام شعراء کے صف میں جہاں خورشید احمد جامی کو جو جدید لب و لہجے کے ایک نمائندہ شاعر ہے، کو جگہ ملی ہے اس میں نہ پروفیسر مغنی تبسم کا نام ہے اور نہ سلیمان ادیب کا۔ یہاں کہیں دور تک حسن نعیم کا نام نظر آتا ہے، نہ شاذ تمکنت کا۔ جدید شعراء کے صف میں تصدق حسین خالد کا نام بھی نہیں ہے۔ اور بیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اردو شاعری کے تجزیاتی مطالعے کے سلسلے میں یہاں بہت سے شعراء کے نام آئے ہیں، وہیں آرزو لکھنوی، ثاقب لکھنوی کا نام شمار نہیں کیا ہے۔ ادیبوں کے صف میں ڈاکٹر زور کو تو جگہ دی ہے لیکن ڈاکٹر عبدالقادر سروری کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اسی طرح دیکھیں گے محققوں کی فہرست میں کہیں پروفیسر سید محمد کا ذکر ہے نہ سیدہ جعفر نے رفیہ سلطانہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھا ہے اور نہ ہی یوسف سرمست کا۔ سرسید اور ان کے معاصرین میں سید علی بلگرامی کا بھی تذکرہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ اور محققین میں شمس اللہ قادری کا ذکر تو کیا ہے مگر ان کی کتابوں کے حوالے نہیں دیے ہیں۔ ایک بات جو زیادہ کھٹکتی ہے اس تاریخ ادب اردو میں کمپوزنگ میں بے انتہا غلطیاں ہیں۔

ناول نگاروں کی فہرست میں جہاں 22 ناول نگار اور افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے وہیں حیدرآباد کی مشہور ومعروف ناول نگار اور افسانہ نویس جیلانی بانو کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ابتداء میں مضمون نگاری، صحافتی خدمات اور دوسرے نثری اقتباسات کے تناظر سے لیا گیا ہے اس میں سب رس کا بھی ذکر ضروری تھا۔ سب رس نے اردو ادب کی ترقی کے لیے بہت ہی نمایاں کارنامہ انجام دی ہے۔ اس رسالے کا آغاز ڈاکٹر زور نے کیا تھا۔ اب تک باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔ اور ایک چیز جو بے حد کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سیدہ جعفر نے ثانوی مآخذ پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ اور کہیں بھی جس حساب سے اس نے استفادہ کیا ہے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ کہیں کہیں تذکرہ کیا ہے، جیسے میر حسن کے سلسلے میں صفحہ 153-152 میں لکھتے ہیں میر حسن 1769-1728 کے درمیان پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1786 میں دائی ازل کو لبیک کہا۔ اور مفتی گنج لکھنو میں مدفون ہوئے گلشن ہند میں مرزا علی لطف نے تاریخ وفات ۔۔۔ تحریر کی ہے۔ لیکن کہیں صفحہ نمبر یا حوالہ نہیں دیا ہے۔ صفحہ 52 میں علی اوسط رشک کا نام اشک لکھا گیا ہے۔ آتش کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ علی اوسط رشک نے آتش کے وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سنہ وفات 25 محرم 1846ء ہے۔ اس وقت آتش کی عمر 81 سال تھی۔ لیکن تاریخی قطع درج کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ نذیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نذیر کے تاریخ وفات 1246 اور 1830 بتائی گئی ہے۔ نذیر کے فرزند گلزار علی اطہر کے لکھے ہوئے قطع تاریخ سے بھی یہی سند بر آمد ہوتا ہے کہ وہ مستند و درست ہے۔ یہاں پر بھی قطع درج نہیں کیا گیا ہے۔ حاتم کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے تذکرہ ہندی میں مصحفی کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے حاتم کا سنہ وفات 1207ھ/1792ء قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں بھی حوالہ نہیں دیا ہے۔ میر دردؔ کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے نوعمری میں مفتی دولت اور سراج الدین خان آرزو سے وہ میر کے مامو

تھے فارسی زبان و ادب کا درس لیا۔ لیکن سید اعجاز حسین نے اپنی کتاب مختصر تاریخ ادب اردو میں خان آرزو کو سوتیلے بھائی کا خالو قرار دیا ہے۔(50)

سودا کے سلسلے میں لکھتی ہے کہ:

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں سودا کا سنہ ولادت 1713ء بتایا ہے لیکن خلیق انجم نے تاریخی شواہد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی پیدائش 1706ء میں ہوئی تھی۔ یہاں بھی حوالہ نہیں دیا ہے کہ یہ بات خلیق انجم نے کہاں لکھی ہے۔ دیا شنکر نسیم کے سلسلے میں لکھتی ہیں کہ نسیم کی تاریخ پیدائش 1227ھ / 1812ء بتائی ہے۔ لیکن رفیق حسین نے 1811ء تحریر کی ہے۔"

اس کتاب میں یہ حوالہ نہیں ہے کہ نسیم کی تاریخ پیدائش کن محققین نے 1227ء قرار دی ہے اور رفیق حسین نے کہاں 1811ء تحریر کی ہے۔ اسی طرح انشا اللہ خان انشا کا سنہ وفات اسلم پرویز اور عابد پشاوری نے 1233ھ/ 1818ء تحریر کیا ہے۔ یہاں بھی کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ شاہ مبارک آبرو کے بارے میں لکھتی ہے کہ آبرو کی تاریخ وفات قاضی عبد الودود نے 1095ھ/ 1783ء بتائی ہے، لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ جو بات بہت کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ سیدہ جعفر نے ثانوی مآخذ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ انھوں نے خود اپنے تئیں راس طور پر کسی اصل تذکرہ یا اصل کتاب کو بنیاد نہیں بنایا ہے۔ زیادہ تر یہاں حوالے سید اعجاز حسین، رام بابو سکسینہ، نور الحسن ہاشمی حتیٰ کہ شجاعت علی سندیلوی کے حوالہ دیتے ہیں۔ چند حوالہ ملاحظہ کریں۔

مظہر جانِ جانان کے بارے میں لکھتے ہیں:

اعجاز حسین نے ان کا سنہ پیدائش 1111ھ/ 1799ء بتایا ہے۔ مختصر تاریخ ادب اردو ص:56

تاریخ ادب اردو صفحہ 68 پر اسی طرح شاکر ناجی کے بارے میں لکھتی ہیں:

جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو ناجیؔ نے میدانِ جنگ میں داد ِشجاعت دی۔(52)

یہ حوالہ سیدہ جعفر نے اپنی کتاب میں صفحہ 46 میں دیا ہے۔اسی طرح صفحہ 42 پر انھوں نے سید اعجاز حسین کے حوالے سے لکھا ہے کہ

انجام کے والد عالم گیری میں سے تھے اور عالم گیری کے صوبے دار تھے۔مختصر تاریخ ادب اردو،ص:148)

صفحہ 158 میں پروفیسر اعجاز حسین نے آتش کے شعری محاسن کو بہت سراہا ہے یہاں کوئی حوالہ نہیں ہے۔

صفحہ 259 پر انھوں نے لکھا ہے کہ اعجاز حسین لکھتے ہیں کہ

گنگا پرشاد لکھنوٴ کا تھا۔ یہاں اعجاز حسین کا نام تو موجود ہے لیکن حوالہ موجود نہیں ہے۔اسی طرح انیس کے سلسلے میں صفحہ 334 پر لکھا ہے کہ

پروفیسر اعجاز حسین انیس 1802، میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں بھی حوالہ نہیں ملتا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس کتاب میں اصل مآخذ کا حوالہ دیتے لیکن انھوں نے ثانوی مآخذ کا حوالہ دیا ہے۔جس سے اس کتاب کا تحقیقی معیار شک وشبہ سے بالاتر نہیں رہا ۔تاریخ کی کتابوں میں دو پہلو ہوتے ہیں، ایک تحقیقی اور دوسرا تنقیدی۔ جہاں تحقیقی پہلو اہم ہوتا ہے وہاں تنقیدی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سیدہ جعفر اردو ادب کے ایک اچھی محقق ہے۔لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے شعراء کے سوانح تحریر کرتے ہوئے زیادہ توجہ نہیں دی۔ جہاں تک شعراء کے کلام پر اظہار رائے کا سوال ہے، سیدہ جعفر نے بہت ہی تفصیل سے شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کلام کے محاسن کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور شعرا کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک چیز جو کٹکتی ہے کہ قدم قدم پر کمپوزنگ کی غلطیاں نظر آتے

ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیدہ جعفر کو اس کتاب کی نظر ثانی کا موقع نہیں ملا ہے۔ کتاب کے آخر میں چاہیے تھا کہ کتابیات کو شامل کیا جاتا، تاکہ اندازہ ہوتا کہ کتاب لکھنے کے دوران انھیں کن کن مصنفین سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن کتابیات کی عدم موجودگی میں یہ بھی اندازہ نہیں کرایا جاسکتا کہ سیدہ جعفر جو محنت اس کتاب کی تحریر میں کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ کیا یہ اچھا ہوتا کہ یہ تاریخ تحقیقی اعتبار سے بھی وزن و وقار کے حامل ہوتی۔

تاریخ ادب کی چوتھے جلد تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب" اردو نثر میں ناول اور افسانے" ہے۔ دوسرے باب کا عنوان" انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی میں اردو شاعری" ہے۔ تیسرا باب ''ترقی پسند شعرا اوران کے ہم عصر سخنوروں'' پر مشتمل ہے۔ باب اول میں احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عزیز احمد، رضیہ سجاد ظہیر، راجندر سنگ بیدی، خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، رام لعل، اپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری، حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں بیسویں صدی کے شعراء میں داغؔ، امیر مینائی، جلال لکھنوی، ظہیر دہلوی، ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جلیل مانک پوری، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، اثر لکھنوی، جمیل مظہری، فراق گورکھ پوری، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، امجد حیدر آبادی کے حالات اور ان کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ''ترقی پسند اور ان کے ہم عصر سخن ور'' کے ضمن میں جوشؔ، مجازؔ، فیضؔ، سردار جعفری، مجروحؔ، کیفیؔ، ساحر لدھیانوی، اختر انصاری، جان نثار اختر، سلام مچھلی شہری، احسان دانش، شاد عارفی، معین احسن جذبی، سیمابؔ اکبر آبادی، سکندر علی وجدؔ، مخدومؔ، غلام ربانی

تاباں، جگن ناتھ آزادؔ، آنند نارئن ملا، ن۔م۔راشد، خلیل الرحمان اعظمی، اختر الایمان، میراجیؔ، خورشید احمد جامی کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔شعراء کی ترتیب میں خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ ترتیب زمانی اعتبار سے نہیں ہے۔ سیماب اکبرآبادی، خلیل الرحمان اعظمی اور کورشید احمد جامی کو ترقی پسند شعرااوران کے ہم عصر سخنوروں میں جگہ دی گئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سیماب اکبر آبادی کو دوسرے باب میں ایک الگ عنوان قائم کر کے خلیل الرحمان اعظمی اور خورشید احمد جامی کو جدید شعراء میں جگہ دی جاتی۔شعراء کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے بڑی رواروی سے کام کیا گیا ہے۔اور زیادہ تر سید اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو سے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس میں کورئی صفحہ ایسا نہیں جو اغلاط سے پاک ہو۔صفحہ 19 میں کل سرخی" احمد ندیم قاسمی" دیا گیا ہے۔ اس کے ضمنی سرخی" اردو نثر میں ناول اور افسانے" دیا ہے۔" اردو نثر میں ناول اور افسانے" یہاں سرخی کے طور پر آنا چاہیے تھا۔ یہ سرخی بھی عجیب سی لگتی ہے۔ کیونکہ ناول اور افسانے نثر ہی کا حصہ ہے۔ اگر اس کا عنوان" ناول اور افسانے" ہوتا تو بہتر تھا۔اور احمد ندیم قاسمی ضمنی سرخی کے ذیل میں ہونا چاہیے تھا۔احمد ندیم قاسمی افسانہ نگار کے علاوہ ایک اچھے شاعر اور نقاد بھی تھے۔ تاہم سیدہ جعفر نے ان کا بحیثیت افسانہ نگار تفصیلی جائزہ لیا ہے، لیکن ان کی شاعری اور تنقید نگاری کا ضمناً ذکر کیا ہے۔

اس کتاب میں سنین، الفاظ اور نام میں بہت جگہوں پر اغلاط پائے جاتے ہیں۔اس جلد میں جو غلاطیاں پائی جاتی ہیں ان کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

صحیح	غلط
گاؤں انگہ	گاؤں انگلہ -ص:19
مناظر	دلفریب مناظرہ -ص:20
بگولے	''پگولے'' -ص:20،21
متنوّع	منتوع -ص:23
عزیز احمد	عزحز احمد -ص:33
معتدبہ	متعدبہ -ص:35
ناول کی تاریخ	ناول کے تاریخ -ص:37
اجاگر	پس منظر کو اجکا کر -ص:38
بیدی غالب اوارڈ حاصل کیا	مودی غالب اوارڈ حاصل کیا -ص:42
Paradox	Pradox -ص:48
زین العابدین	ذین العابدین -ص:48
''بمبئی رات کی باہوں میں''	''لمبی رات کی باہوں میں'' -ص:49
طمطراق	طمطران -ص:70
علامتی	عالامتی
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو	اگلے جنم موہے بیٹا نہ کچو -ص:85
وضع کیا	واضع کیا -ص:87
تہذیبی رجحانات	تہذیبی رجحاینات -ص:92
پرچھائیں اور دھند لکے	پرچھائیں اور دھند کے -ص:94
زمستاں	اس میں ''رمتاں'' -ص:97
ہیئت کے جو تجربے	ہیئت کے جو تجرے -ص:98

غلط	صحیح
”خانی وبہادر“ -ص:103	خان بہادر
ذرایع مسدور -ص:103	ذرائع مسدود
آصف سادس میر محبوب علی خان -ص:103	آصف جاہ میر محبوب علی خان
مارچ189ء -ص:103	مارچ1890ء
طریبہ -ص:104	طربیہ
دلی کے محاووں -ص:106	دلی کے محاوروں
داغ کے عشق پر مادائیت -ص:108	داغ کے عشق پر ماورائیت
قاری کو مرغوب کرنے -ص:118	مرعوب
اوسط رشک کے شاگرد -ص:120	اوسط علی رشک کے شاگرد
حکم احسن اللہ -ص:129	حکیم احسن اللہ
دبتانِ لکھنو -ص:133	دبستانِ لکھنؤ
ماہنگامہ گل کدہ -ص:141	ماہنامہ
بیسوں صدی میں -ص:142	بیسویں صدی میں
آخری ایم تک -ص150	آخری ایاّم تک
مغنی تبسیم -ص:152	مغنی تبسم
تشبیہات واستادات -ص:161	تشبیہات واستعارات
Elegy Written in the country curch Yard -ص:181	Elegy Written in the country Churchyard
خیال سے منفق ہیں -ص:183	خیال سے متفق ہیں
معرفت ومنانت وسنجیدگی -ص:192	معرفت ومتانت وسنجیدگی
اصل نام داور خان (اختر شیرانی) -ص:214	داؤد خان
آغاز خشر نے -ص:215	آغا حشر

اختتامیہ

ادب کی تاریخ لکھنا بہت بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ اس میں ماضی کا رشتہ حال سے جوڑتے ہوئے مستقبل کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ادبی تاریخ میں قوم کی سیاسی ،سماجی اور تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ لسانی و ادبی روایات کے ذہنی وفکری ارتقا کی داستان پیش کیا جاتا ہے۔ ادبی تاریخ لکھتے وقت پورے تاریخی اور تنقیدی شعور سے کام لینا پڑتا ہے۔ذراسی بھی بے احتیاطی اور غیر ذمہ دارانہ انداز تاریخ ادب کو غیر معتبر بنا دیتی ہے۔

اردو زبان میں ادبی تاریخ کی روایت خاصی پرانی ہے۔"آب حیات" سے اس روایت کا آغاز ہوتا ہے۔تذکرہ اور تاریخ کی اس درمیانی کڑی میں ادبی تاریخ کی بہت سے اہم نکات پائے جاتے ہیں۔اس کے بعد عصر حاضر تک مختصر اور ضخیم ادبی تاریخیں وجود میں آچکی ہیں۔ان میں بعض ایسے ہیں جو پورے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔اور بعض ادب کے کسی ایک پہلو، یعنی نظم یا نثر، ناول یا افسانہ وغیرہ، کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کی "آب حیات" جو تاریخ ادب کی روایت کا نقطہ آغاز سمجھی جاتی ہے۔صرف شاعری کی تاریخ قلم بند کیے ہیں۔اس میں لسانی مباحث کا باقاعدہ آغاز ہوا اور شعراء کی تاریخ کو زمانی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد شائع ہونے والی ادبی تاریخ رام بابو سکسینہ کی" تاریخ ادب اردو" ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو تاریخ ادب کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ اس میں انگریزی تاریخ ادب کی روایت کے زیر اثر ادب کا جائزہ ایک اکائی کی صورت میں لیا گیا ہے۔اور اس میں شاعری اور نثر اکٹھے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا آغاز لسانی مباحث سے ہوتا ہے۔پھر شعراء کے حلات زمانی تسلسل میں بیان کیے گئے ہیں۔شاعری کے بعد نثر کی تاریخ سے متعارف کرایا گیا ہے۔رام بابو سکسینہ کی یہ کتاب ایک باقاعدہ روایت بن گیا۔اور بعد میں لکھنے والوں نے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

ادبی تاریخ نگاری کی روایت کا پہلا موضوع لسانی مباحث ہے۔جن میں زبان کے آغاز وارتقاء کا حال دیا جاتا ہے۔ابتدائی ادبی تاریخوں میں لسانی مباحث سیدھے سادے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے اس میں لسانی مباحث بھی ایک اہم جزو بن گیا۔ تاریخ ادب میں لسانی مباحث کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔مگر اردو ادب کی اکثر تاریخ نویسیوں نے لسانی معلومات سے اپنی تاریخ ادب کو مفید بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔بعض اوقات یہ لسانی بیانات کافی تفصیلی اور پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔ یہ عام قارئین کے لیے اکتاہٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ بہت ہی کم ادبی تاریخیں ایسے ہیں جس میں زبان کے آغاز وارتقاء کے بجائے براہ راست ادب کے ارتقاء کو بیان کیا گیا ہو۔مثلاً عبدالقادر سروری کی ''اردو ادب کی تاریخ۔''

اردو کی ابتدائی تاریخوں پر تذکروں کا اثر نمایاں ہے۔ یہ دوطرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان تاریخوں میں تذکروں کی طرح شاعری کو نثر پر فوقیت دی جاتی ہے، اور ان دونوں کو الگ الگ جزو کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔یعنی پہلے شعراء اوران کی شاعری بیان کی جاتی ہے اور بعد میں نثر کی تاریخ کا تذکرہ ملتا ہے۔اس کی خامی یہ ہے کہ ایک ہی کتاب میں ایک ہی شخصیت کا تذکرہ بحیثیت شاعر اور بحیثیت نثر نگار الگ الگ ملتا ہے۔تذکروں میں عموماً شعراء کا تذکرہ ابجدی یا حروف تہجی کے اعتبار سے ملتا ہے اور شعراء کے تراجم کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ پہلے نام اور تخلص تحریر کیا جاتا ہے۔اس کے مختصر حالاتِ زندگی کا بیان ہوتا ہے۔سنہ ولادت اور سنہ وفات اگر میسر آجائیں تو اسے بھی تحریر کرتے ہیں۔مختصر طور پر کلام پر تاثراتی رائے دی جاتی ہے اور آخر میں نمونہ کلام دیے جاتے ہیں۔تذکروں میں شعراء کا فنی روایت میں مقام ومرتبہ متعین نہیں کیا جاتا۔ ادبی تاریخ میں بھی یہی انداز اپنایا گیا ہے۔

روایت کے تحت لکھی گئی ادبی تاریخوں میں سیاسی پس منظر کا بیان ضروری سمجھا جاتا ہے۔لسانی مباحث کے بعد اکثر سیاسی پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔ یا پھر ہر دور سے پہلے اس دور کا

مختصر سیاسی پس منظر پیش کیا جاتا ہے۔لیکن ان سیاسی حالات کا ادب پر کیا اثر ہوتا ہے تحلیقی شخصیتیں اوران کی تخلیقات ان حالات سے کس طرح متاثر ہوئے ان باتوں کی وضاحت نہیں کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب میں ان چیزوں کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے سماجی اور سیاسی حالات ادب اور ادیب کو متاثر کرتے ہیں، اس کا خلاصہ اپنی تاریخ ادب میں پیش کیا ہے۔

ادب کو ادوار تقسیم کرکے پیش کرنے کی روایت تذکروں سے شروع ہوئی ہے۔ سب سے پہلے قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے ''مخزن نکات'' میں تین ادوار قائم کیے۔ وہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے عنوان سے یہ تقسیم قائم کی تھی۔ اس دور میں بہت سے تذکرے اسی شکل کو اپنایا۔ یہ طریقہ آگے چل کر مختلف عنوانوں میں تبدیل ہونے لگے۔ جیسے ''دکنی ادب''، ''بہار میں اردو'' وغیرہ عنوانات پر تاریخ ادب لکھنے کا رواج شروع ہوا۔

اردو ادب میں موجود اکثر معلومات کے بنیادی ماخذ تذکرے ہیں۔ ان میں میر تقی میرؔ کا ''نکات الشعراء''، قائم چاند پوری کا ''مخزن نکات'' قدرت اللہ قاسم کا ''مجموعہ نغز''، مصطفیٰ خان شیفتہ کا ''گلشن بے خار'' اور مصحفیؔ کا ''تذکرہ ہندی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تذکروں میں اردو ادب کے ابتدائی کارناموں کا نقشہ ملتا ہے۔ جب ادبی تاریخ کی روایت کا آغاز ہوا تو اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج زندہ تھا۔ اور مورخِ ادب ان تذکروں سے جو معلومات حاصل کیے اسے بنیادی ماخذ کا درجہ دے کر ان کی صحت کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اور دیگر ذرائع سے ان کی تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اس لیے ابتدائی ادبی تاریخوں میں ایسی بہت سی معلومات ملتی ہیں جسے بعد کی تحقیقات نے غلط قرار دیا گیا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں اکثر سنین کے اندراج میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ نقل در نقل کے باعث غلط سنین بلا تحقیق درج کر لیے جاتے ہیں۔ حالانکہ تاریخ ادب میں سنین کو ہی اصل اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی سنجیدہ قاری کسی شاعر یا ادیب کا سنہ ولادت یا سنہ

وفات جاننے کے لیے تاریخ ادب ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مگر اردو میں لکھی گئی اکثر ادبی تاریخوں میں یا تو سنین درج نہیں ہوتے یا جو سنین دیے جاتے ہیں ان کی جانچ پرکھ بھی درست طریقے سے نہیں کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہجری اور عیسوی تقویم کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اکثر تاریخوں میں یا تو صرف ہجری سنین ملتے ہیں یا پھر صرف عیسوی سنین ہی درج ہوتے ہیں۔ 1857ء سے پہلے بالعموم ہجری تقویم کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور 1857ء کے بعد عیسوی تقویم کا چلن عام ہوا۔ اسی لیے اردو کی ادبی تاریخوں میں وقت اور دور کے درست تعین کے لیے دونوں تقویمیں اکٹھی تحریر کی جاتی ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں پائے جانے والی ایک خامی یہ ہے کہ ان میں ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاتی ہے۔ جن ادبی تاریخوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے۔ البتہ ''سیرالمصنفین'' کے مصنف یحیٰ تنہا نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ماخذ کی نشاندہی کی ہے، جن سے وہ استفادہ کیا تھا۔ ایک اور خامی یہ ہے کہ ان میں شعراء اور ادباء کے کلام وفن کے نمونے اکثر نہیں دیے جاتے تھے۔ اور ان کے کلام پر کھل کر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادبی روایات میں متعلقہ شاعر یا ادیب کے مقام و مرتبہ کا تعین نہیں ہو پاتا اور یوں تاریخ ادب کا ایک اہم فریضہ یعنی ادبی روایات کے ضمن میں فن کاروں اور ان کے فن پاروں کی صحیح قدر و قیمت متعین نہیں کر سکتے۔

اردو میں لکھی گئی اکثر ادبی تواریخ نصابی ضروریات پوری کرنے کے لیے معرض وجود میں آئی تھی۔ اسی لیے ایسی تاریخوں میں بہت سرسری اور مختصر بنیادی معلومات ہی فراہم کی ہیں۔ اسی طرح رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کے دیباچے میں وضاحت کی ہے کہ انہوں نے یہ تاریخ انگریزی جاننے والے طلبہ کی آگاہی کے لیے تحریر کی ہے۔ اسی لیے اس میں صرف اتنی اور ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو ان طلبہ کے لیے ضروری ہیں، اس لیے اس میں نمونوں اور مثالوں کی کمی ہے۔

اردو کی اکثر ادبی تواریخ انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔جس کی وجہ سے تسامحات اورغلطیاں ان میں برآمد ہوئے ہیں۔ایک فرداپنے محدود وسائل کی بناء پر بہت سے اصل ماخذ تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا جس کے نتیجے میں معلومات سرسری اور نامکمل ہوجاتی ہیں۔

عموماًادبی تاریخ لکھتے ہوئے تاریخ کی آسان تفہیم کے لیےاسے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہےاوراس دور کے حوالے سے ان کی ادبی خصوصیات متعین کی جاتی ہیں۔مگراس تقسیم میں سب سے اہم چیز زمانی ربط وتسلسل کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔کیونکہ اسی زمانی تسلسل میں ہی مختلف تحریکوں کی نشاندہی اوران کے زیر اثر تخلیق کردہ فن پاروں کی شناخت کی جاتی ہے۔اورمختلف ادوار کی نمائندہ ادبی شخصیات کی پہچان ہوتی ہے۔اس لیے ایک دور یا ایک عہد کے حالات و واقعات،رجحانات اوران کے اثرات کے بیان میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ متضاد خیالات اورغیرضروری انتسابات ایک اچھی ادبی تاریخ کوغیرمعتبر بنا سکتا ہے۔

ادبی تاریخوں میں اکثر انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کےنصف اول تک کا ذکر ملتا ہے۔بہت کم مورخ ایسے ملتے ہیں جوآگے چلنے کی ہمت کی ہے۔اپنے معاصرین شعراءوادبا کا ذکر کبھی نہیں پیش کیا جاتا۔ایسا لگتا ہے کہ اعتراضات اوردشمنی کے ڈر سے مورخ اس کام سے پیچھے ہٹے ہیں۔میرتقی میرؔ کے تذکرے''نکات الشعراء'' اس بات کی شہادت دیتی ہے۔میرؔاپنے تذکرے میں اپنے معاصرینکی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔توان کے جواب میں لکھے گئے تذکوں میں ان کے شاگردوں اورحامی شعراء کا بھی مذاق اڑایا گیا۔یہی وجہ ہوگی اکثر مورخین ادب اپنے معاصرین کا ذکرنہیں کرتے اواگرکرتے ہیں توبھی سرسری تذکرہ ہی پیش کردیتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں پائے جانے والی ایک اور خامی طباعت یا پرنٹنگ کے نقائص ہیں۔جوایک معیاری تاریخ کوغیرمعیاری اورغیرمعتبر بنا دیتے ہیں۔سیدہ جعفر کی ''تاریخ ادب اردو'' اس کی ایک مثال ہے۔

ہماری ادبی تاریخوں کی عمومی روایت ہے اس میں خوبیوں کے ساتھ بہت سے خامیاں بھی موجود ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اتنی وسیع وعریض ہو چکی ہے کہ اگر کوئی ایک فرد اسے مرتب کرنا چاہے تو اسے ایک معیاری تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جبکہ مورخین کی ایک جماعت مل کر اسی تاریخ کو نسبتاً کم وقت میں مرتب کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ کسی ادارے کی جانب سے تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک مجلس ادارت قائم کی جائے جو اعلیٰ مصنفین اور محققین اور ناقدین پر مبنی ہو۔

اردو کی قدیم ادبی تاریخیں موجودہ دور صرف تاریخی نوعیت کی حیثیت ہے۔ کیونکہ نئے حقائق کی دریافت اور معلومات میں اضافوں کی وجہ سے ان تاریخوں میں موجود حقائق اور معلومات اپنی حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ اردو ادب کا دامن عہد حاضر میں بہت وسیع ہو گیا ہے۔ نئے دور کے تحقیقات سے ابھری نئی معلومات سے پرانی معلومات میں تصحیح اور اضافے ہوئے۔ اس لیے موجودہ دور میں قدیم تاریخ ادب کو وہ مقام حاصل نہیں جو ایک زمانے میں اسے میسر تھا۔

عہد حاضر میں ادبی تاریخ کا ایک مستند اور مکمل معلومات کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ اس لیے ایک ایسی ادبی تاریخ کی مانگ اب بھی ہے، جس میں آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کے مکمل اور درست حالات وواقعات کا منظر پیش کیا گیا ہو۔

الغرض یہ تمام تاریخیں بہت سی خوبیوں اور خامیوں کی حامل اپنی جگہ اہم اور معتبر ہیں مگر اتنی بہت سی تاریخوں میں جو ادبی تاریخ کی روایت میں دائمی حیثیت کی حامل ہے۔ ان میں دو اہم کتاب سرفہرست ہے۔ ایک رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ جو بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری کتاب جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ یہ کارنامہ اعلیٰ تحقیقی، تنقیدی معیار، معلومات اور اسلوب بیان کے حوالے سے زندہ جاوید ہے۔

کتابیات

	مصنف/مؤلف	کتاب	ناشر	سنہ اشاعت
1	آزاد، محمد حسین	آبِ حیات	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1970
2	ادیب، شاہ ابوالحسن	غازیٔ اعظم	فرید بک ڈپو، نئی دہلی	2005
3	اختر، سلیم	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1991
4	اعظمی، خلیل الرحمٰن	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1984
5	الٰہی، محمود	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	اتر پریش اردو اکادمی لکھنؤ	1983
6	تنہا، محمد یحییٰ	سیر المصنفین (جلد اول)	ادارہ، اشاعت ادب، میرٹھ	1976
7	جالبی، جمیل	تاریخ ادب اردو (جلد اول دوم)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1984
8	جین، گیان چند	اردو مثنوی شمالی ہند میں	انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی	1987
9	جاوید، علی	برطانوی مستشرقین اور تاریخِ ادب اردو	اردو مجلس، دہلی	1992
10	حسن، محمد	اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	ادارہ تصنیف، علی گڑھ	1964
11	حسن، محمد	ہندی ادب کی تاریخ	اورینٹ لانگ مین	1973
12	حسن، محمد	مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ	ترقی اردو، نئی دہلی	2000
13	حسن، محمد	قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	1998
14	حسن، محمد	اردو ادب میں رومانوی تحریک	دانش محل، لکھنؤ	1955
15	حسن، میر	تذکرہ شعرائے اردو	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1985
		مرتبہ حبیب الرحمٰن خان	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد	1972
16	حسین، سید احتشام	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	ترقی اردو بیورو، نئی دلی	1988
17	حسین، سید اعجاز	مختصر تاریخ ادب اردو	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	1965

18	حسینی،علی عباس	اردو ناول کی تاریخ اور تنقید	ایجوکیشنل ہاؤس،علی گڑھ	1995
19	خان، یوسف حسین	فرانسیسی ادب	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	1962
20	خاں، رشید حسن	ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ	ایجوکیشنل بل ہاؤس،علی گڑھ	1978
21	رحمانی،عشرت	اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1987
22	رحمانی،عشرت	اردو ڈرامے کا ارتقا	علی گڑھ بک ڈپو،علی گڑھ	1978
23	رضوی، سید محمد عقیل	اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں	اردو اکادمی،لکھنؤ	1989
24	زیدی،علی جواد	تاریخ ادب کی تدوین	نصرت پبلشیرز،لکھنؤ	1983
25	زیدی،علی جواد	دو ادبی اسکول	نسیم بک ڈپو،لکھنؤ	1985
26	زیدی،علی جواد	قصیدہ نگاران،	اتر پردیش اردو اکادمی	1986
27	زور، سید محی الدین قادری	دکنی ادب کی تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1989
28	سکسینہ، رام بابو	تاریخ ادب اردو	منشی تیج کمار پرائیویٹ لمیٹڈ،لکھنؤ	1986
29	سروری،عبدالقادر،	اردو مثنوی کا ارتقا	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1979
30	سروری،عبدالقادر	اردو کی ادبی تاریخ	گلشن پبلشرز، شرینگر	1987
31	سرور، اعظم الدولہ	عمدہ،منتخبہ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی	1961
32	سدید، انور	اردو ادب کی مختصر تاریخ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1991
33	صدیقی، ابواللیث	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	اردو پبلشرز،لکھنؤ	1973
34	صدیقی، ابواللیث	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1995
35	عبداللہ، سید	سر سید اور ان کے نامور رفقاء	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1988
36	عبداللہ، سید	شعرائے اردو کے تذکرے	مکتبہ جدید، لاہور	1952
37	عبدالحی،حکیم سید	گل رعنا	دارالمصنفین،شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	1990
38	فاروقی،محمد احسن	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	1981
39	فتحپوری،فرمان	اردو رباعی	مکتبہ سنگ میل کراچی، پاکستان	1978

40	قادری، حامد حسن	داستانِ تاریخ اردو	لکشمی نرائن اگروال، آگرہ	1966
41	قادری، سید شمس اللہ	اردوئے قدیم	مطبع تیج کمار، لکھنؤ	1967
42	قائم، قیام الدین	مخزن نکات	انجمن، ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد	1967
43	کریم الدین	طبقات شعرائے ہند	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1983
44	گردیزی، فتح علی	تذکرہ ریختہ گویاں مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد	
45	لطف، مرزا علی	گلزار ابراہیم وگلشن ہند		
		مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ای۔بی۔ایچ علی گڑھ	1934
46	مسیح الزمان	اردو مرثیے کا ارتقا	اردو اکادمی، لکھنؤ	1983
47	مسیح الزمان	اردو تنقید کی تاریخ	اتر پریدش اردو اکادمی، لکھنؤ	1987
48	مجیب، محمد	روسی ادب	مکتبہ جامد لمیٹڈ، نئی دہلی	1982
49	محمد، سید	ارباب نثر اردو	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1977
50	میر تقی میر	نکات الشعراء مرتبہ عبدالحق	انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد	1935
51	مصحفی	تذکرہ ہندی	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد	1934
52	نعمانی، شبلی	شعر العجم جلد 1	معارف اعظم گڑھ	1988
53	نظامی، خلیق احمد	سر سید اور علی گڑھ تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	
54	ندوی، عبدالسلام	شعر الہند (حصہ اول، دوم)	دار المصنفین، اعظم گڑھ	1987
55	نقوی، حنیف	شعرائے اردو کے تذکرے	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1986
56	ہاشمی، نصیر الدین	دکن میں اردو	ترقی اردو بیدرو، نئی دہلی	1985
57	ہاشمی، نور الحسن	دہلی کا دبستان شاعری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	1985
58	یٰسین، محمد	انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1992

English Books:

1. Carr E.H. What is History Penquin Books 1987
2. Cohen Ralph, New direction in Literary History
   John Hopkins University press 1974
3. Pandey Manager, Sahitya aur Itihas Drishti
   People Literacy Delhi 1981
4. Wellek Rene, Warren Austin, Theory of Literacy
   Penquin Books 1985
5. Wellek Rene, D Discriminations
   Vikas Publication New Delhi 196?
6. Wellek Rene, The Rise of English Literary History
   University of forth Carolina press, New York 1941

Websites

1. www.rekhta.org
2. www.urdulughat.info
3. www.urdulibrary.org

اردو کی منتخب ادبی تواریخ: تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مقالہ

یونیورسٹی آف میسور مانسا گنگوتری

میں

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا

مقالہ نگار

حجاز لطیف سی۔سی۔او

نگران

پروفیسر یس۔ مسعود سراج

سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس وصدر

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف میسور

یونیورسٹی آف میسور، میسور

2019

URDU KI MUNTAKHAB ZAKHEEM ADABI TAWAREEKH

TAHQEEQI-O-TANQEEDI JAEZA

THESIS

Submitted to University of Mysore in fulfillment of the requirements

For the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

HIJAS LATHEEF C.C.O

Under the Supervision of

Dr. S. MASOOD SIRAJ
Former Dean faculty of Arts and Chairman
Department of Studies in Urdu

DEPARTMENT OF STUDIES IN URDU
UNIVERSITY OF MYSORE, MYSORE

2019

اختتامیہ

ادب کی تاریخ لکھنا بہت بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ اس میں ماضی کا رشتہ حال سے جوڑتے ہوئے مستقبل کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ادبی تاریخ میں قوم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ لسانی و ادبی روایات کے ذہنی وفکری ارتقا کی داستان پیش کیا جاتا ہے۔ ادبی تاریخ لکھتے وقت پورے تاریخی اور تنقیدی شعور سے کام لینا پڑتا ہے۔ذراسی بھی بے احتیاطی اور غیر ذمہ دارانہ انداز تاریخ ادب کو غیر معتبر بنا دیتی ہے۔

اردو زبان میں ادبی تاریخ کی روایت خاصی پرانی ہے۔"آب حیات" سے اس روایت کا آغاز ہوتا ہے۔تذکرہ اور تاریخ کی اس درمیانی کڑی میں ادبی تاریخ کی بہت سے اہم نکات پائے جاتے ہیں۔اس کے بعد عصر حاضر تک مختصر اور ضخیم ادبی تاریخیں وجود میں آچکی ہیں۔ان میں بعض ایسے ہیں جو پورے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔اور بعض ادب کے کسی ایک پہلو، یعنی نظم یا نثر، ناول یا افسانہ وغیرہ، کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کی"آب حیات" جو تاریخ ادب کی روایت کا نقطہ آغاز سمجھی جاتی ہے۔صرف شاعری کی تاریخ قلم بند کیے ہیں۔اس میں لسانی مباحث کا باقاعدہ آغاز ہوا اور شعراء کی تاریخ کو زمانی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد شائع ہونے والی ادبی تاریخ رام بابو سکسینہ کی" تاریخ ادب اردو" ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو تاریخ ادب کی شکل میں منظر عام پر آئی۔ اس میں انگریزی تاریخ ادب کی روایت کے زیر اثر ادب کا جائزہ ایک اکائی کی صورت میں لیا گیا ہے۔اور اس میں شاعری اور نثر اکٹھے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا آغاز لسانی مباحث سے ہوتا ہے۔پھر شعراء کے حلات زمانی تسلسل میں بیان کیے گئے ہیں۔شاعری کے بعد نثر کی تاریخ سے متعارف کرایا گیا ہے۔رام بابو سکسینہ کی یہ کتاب ایک باقاعدہ روایت بن گیا۔اور بعد میں لکھنے والوں نے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

ادبی تاریخ نگاری کی روایت کا پہلا موضوع لسانی مباحث ہے۔ جن میں زبان کے آغاز و ارتقاء کا حال دیا جاتا ہے۔ ابتدائی ادبی تاریخوں میں لسانی مباحث سیدھے سادے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے اس میں لسانی مباحث بھی ایک اہم جزو بن گیا۔ تاریخ ادب میں لسانی مباحث کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مگر اردو ادب کی اکثر تاریخ نویسیوں نے لسانی معلومات سے اپنی تاریخ ادب کو مفید بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لسانی بیانات کافی تفصیلی اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ عام قارئین کے لیے اکتاہٹ کا باعث بن جاتا ہے۔ بہت ہی کم ادبی تاریخیں ایسے ہیں جس میں زبان کے آغاز و ارتقاء کے بجائے براہ راست ادب کے ارتقاء کو بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً عبدالقادر سروری کی ''اردو ادب کی تاریخ۔''

اردو کی ابتدائی تاریخوں پر تذکروں کا اثر نمایاں ہے۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان تاریخوں میں تذکروں کی طرح شاعری کو نثر پر فوقیت دی جاتی ہے، اور ان دونوں کو الگ الگ جزو کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلے شعراء اور ان کی شاعری بیان کی جاتی ہے اور بعد میں نثر کی تاریخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی خامی یہ ہے کہ ایک ہی کتاب میں ایک ہی شخصیت کا تذکرہ بحیثیت شاعر اور بحیثیت نثر نگار الگ الگ ملتا ہے۔ تذکروں میں عموماً شعراء کا تذکرہ ابجدی یا حروف تہجی کے اعتبار سے ملتا ہے اور شعراء کے تراجم کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ پہلے نام اور تخلص تحریر کیا جاتا ہے۔ اس کے مختصر حالاتِ زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ سنہ ولادت اور سنہ وفات اگر میسر آجائیں تو اسے بھی تحریر کرتے ہیں۔ مختصر طور پر کلام پر تاثراتی رائے دی جاتی ہے اور آخر میں نمونہ کلام دیے جاتے ہیں۔ تذکروں میں شعراء کا فنی روایت میں مقام و مرتبہ متعین نہیں کیا جاتا۔ ادبی تاریخ میں بھی یہی انداز اپنایا گیا ہے۔

روایت کے تحت لکھی گئی ادبی تاریخوں میں سیاسی پس منظر کا بیان ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لسانی مباحث کے بعد اکثر سیاسی پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔ یا پھر ہر دور سے پہلے اس دور کا

مختصر سیاسی پس منظر پیش کیا جاتا ہے۔لیکن ان سیاسی حالات کا ادب پر کیا اثر ہوتا ہے تحلیقی شخصیتیں اوران کی تخلیقات ان حالات سے کس طرح متاثر ہوئے ان باتوں کی وضاحت نہیں کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب میں ان چیزوں کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے سماجی اور سیاسی حالات ادب اور ادیب کو متاثر کرتے ہیں،اس کا خلاصہ اپنی تاریخ ادب میں پیش کیا ہے۔

ادب کو ادوار تقسیم کر کے پیش کرنے کی روایت تذکروں سے شروع ہوئی ہے۔سب سے پہلے قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے ''مخزن نکات'' میں تین ادوار قائم کیے۔ وہ متقدمین،متوسطین اورمتاخرین کے عنوان سے یہ تقسیم قائم کی تھی۔اس دور میں بہت سے تذکرے اسی شکل کو اپنایا۔ یہ طریقہ آگے چل کر مختلف عنوانوں میں تبدیل ہونے لگے۔جیسے ''دکنی ادب''، ''بہار میں اردو'' وغیرہ عنوانات پر تاریخ ادب لکھنے کا رواج شروع ہوا۔

اردو ادب میں موجود اکثر معلومات کے بنیادی ماخذ تذکرے ہیں۔ان میں میر تقی میرؔ کا ''نکات الشعراء''،قائم چاند پوری کا ''مخزن نکات'' قدرت اللہ قاسم کا ''مجموعہ نغز''،مصطفیٰ خان شیفتہ کا ''گلشن بے خار'' اور مصحفیؔ کا ''تذکرہ ہندی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان تذکروں میں اردو ادب کے ابتدائی کارناموں کا نقشہ ملتا ہے۔ جب ادبی تاریخ کی روایت کا آغاز ہوا تو اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج زندہ تھا۔ اور مورخِ ادب ان تذکروں سے جو معلومات حاصل کیے اسے بنیادی ماخذ کا درجہ دے کر ان کی صحت کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اور دیگر ذرائع سے ان کی تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اس لیے ابتدائی ادبی تاریخوں میں ایسی بہت سی معلومات ملتی ہیں جسے بعد کی تحقیقات نے غلط قرار دیا گیا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں اکثر سنین کے اندراج میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ نقل در نقل کے باعث غلط سنین بلا تحقیق درج کر لیے جاتے ہیں۔ حالانکہ تاریخ ادب میں سنین کو ہی اصل اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی سنجیدہ قاری کسی شاعر یا ادیب کا سنہ ولادت یا سنہ

وفات جاننے کے لیے تاریخ ادب ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مگر اردو میں لکھی گئی اکثر ادبی تاریخوں میں یا تو سنین درج نہیں ہوتے یا جو سنین دیے جاتے ہیں ان کی جانچ پرکھ بھی درست طریقے سے نہیں کی جاتی ہے۔ اسی طرح ہجری اور عیسوی تقویم کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اکثر تاریخوں میں یا تو صرف ہجری سنین ملتے ہیں یا پھر صرف عیسوی سنین ہی درج ہوتے ہیں۔ 1857ء سے پہلے بالعموم ہجری تقویم کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور 1857ء کے بعد عیسوی تقویم کا چلن عام ہوا۔ اسی لیے اردو کی ادبی تاریخوں میں وقت اور دور کے درست تعین کے لیے دونوں تقویمیں اکٹھی تحریر کی جاتی ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں پائے جانے والی ایک خامی یہ ہے کہ ان میں ماخذ کی نشاندہی نہیں کی جاتی ہے۔ جن ادبی تاریخوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے۔ البتہ ''سیر المصنفین'' کے مصنف یحیٰی تنہا نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ماخذ کی نشاندہی کی ہے، جن سے وہ استفادہ کیا تھا۔ ایک اور خامی یہ ہے کہ ان میں شعراء اور ادباء کے کلام وفن کے نمونے اکثر نہیں دیے جاتے تھے۔ اور ان کے کلام پر کھل کر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادبی روایات میں متعلقہ شاعر یا ادیب کے مقام ومرتبہ کا تعین نہیں ہو پاتا اور یوں تاریخ ادب کا ایک اہم فریضہ یعنی ادبی روایات کے ضمن میں فن کاروں اور ان کے فن پاروں کی صحیح قدر وقیمت متعین نہیں کر سکتے۔

اردو میں لکھی گئی اکثر ادبی تواریخ نصابی ضروریات پوری کرنے کے لیے معرض وجود میں آئی تھی۔ اسی لیے ایسی تاریخوں میں بہت سرسری اور مختصر بنیادی معلومات ہی فراہم کی ہیں۔ اسی طرح رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کے دیباچے میں وضاحت کی ہے کہ انہوں نے یہ تاریخ انگریزی جاننے والے طلبہ کی آگاہی کے لیے تحریر کی ہے۔ اسی لیے اس میں صرف اتنی اور ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو ان طلبہ کے لیے ضروری ہیں، اس لیے اس میں نمونوں اور مثالوں کی کمی ہے۔

اردو کی اکثر ادبی تواریخ انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جس کی وجہ سے تسامحات اور غلطیاں ان میں برآمد ہوئے ہیں۔ ایک فرد اپنے محدود وسائل کی بناء پر بہت سے اصل ماخذ تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا جس کے نتیجے میں معلومات سرسری اور نامکمل ہو جاتی ہیں۔

عموماً ادبی تاریخ لکھتے ہوئے تاریخ کی آسان تفہیم کے لیے اسے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس دور کے حوالے سے ان کی ادبی خصوصیات متعین کی جاتی ہیں۔ مگر اس تقسیم میں سب سے اہم چیز زمانی ربط و تسلسل کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی زمانی تسلسل میں ہی مختلف تحریکوں کی نشاندہی اور ان کے زیر اثر تخلیق کردہ فن پاروں کی شناخت کی جاتی ہے۔ اور مختلف ادوار کی نمائندہ ادبی شخصیات کی پہچان ہوتی ہے۔ اس لیے ایک دور یا ایک عہد کے حالات و واقعات، رجحانات اور ان کے اثرات کے بیان میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ متضاد خیالات اور غیر ضروری انتسابات ایک اچھی ادبی تاریخ کو غیر معتبر بنا سکتا ہے۔

ادبی تاریخوں میں اکثر انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے نصف اول تک کا ذکر ملتا ہے۔ بہت کم مورخ ایسے ملتے ہیں جو آگے چلنے کی ہمت کی ہے۔ اپنے معاصرین شعراء وادبا کا ذکر کبھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اعتراضات اور دشمنی کے ڈر سے مورخ اس کام سے پیچھے ہٹے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعراء'' اس بات کی شہادت دیتی ہے۔ میرؔ اپنے تذکرے میں اپنے معاصرینکی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ تو ان کے جواب میں لکھے گئے تذکوں میں ان کے شاگردوں اور حامی شعراء کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ یہی وجہ ہوگی اکثر مورخین ادب اپنے معاصرین کا ذکر نہیں کرتے اوا گر کرتے ہیں تو بھی سرسری تذکرہ ہی پیش کر دیتے ہیں۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں پائے جانے والی ایک اور خامی طباعت یا پرنٹنگ کے نقائص ہیں۔ جو ایک معیاری تاریخ کو غیر معیاری اور غیر معتبر بنا دیتے ہیں۔ سیدہ جعفر کی ''تاریخ ادب اردو'' اس کی ایک مثال ہے۔

ہماری ادبی تاریخوں کی عمومی روایت ہے اس میں خوبیوں کے ساتھ بہت سے خامیاں بھی موجود ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اتنی وسیع وعریض ہو چکی ہے کہ اگر کوئی ایک فرد اسے مرتب کرنا چاہے تو اسے ایک معیاری تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جبکہ مورخین کی ایک جماعت مل کر اسی تاریخ کو نسبتاً کم وقت میں مرتب کر سکتی ہے۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ کسی ادارے کی جانب سے تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک مجلس ادارت قائم کی جائے جو اعلیٰ مصنفین اور محققین اور ناقدین پر مبنی ہو۔

اردو کی قدیم ادبی تاریخیں موجودہ دور صرف تاریخی نوعیت کی حیثیت ہے۔ کیونکہ نئے حقائق کی دریافت اور معلومات میں اضافوں کی وجہ سے ان تاریخوں میں موجود حقائق اور معلومات اپنی حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ اردو ادب کا دامن عہد حاضر میں بہت وسیع ہو گیا ہے۔ نئے دور کے تحقیقات سے ابھری نئی معلومات سے پرانی معلومات میں تصیح اور اضافے ہوئے۔ اس لیے موجودہ دور میں قدیم تاریخ ادب کو وہ مقام حاصل نہیں جو ایک زمانے میں اسے میسر تھا۔

عہد حاضر میں ادبی تاریخ کا ایک مستند اور مکمل معلومات کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ اس لیے ایک ایسی ادبی تاریخ کی مانگ اب بھی ہے، جس میں آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کے مکمل اور درست حالات وواقعات کا منظر پیش کیا گیا ہو۔

الغرض یہ تمام تاریخیں بہت سی خوبیوں اور خامیوں کی حامل اپنی جگہ اہم اور معتبر ہیں مگر اتنی بہت سی تاریخوں میں جو ادبی تاریخ کی روایت میں دائمی حیثیت کی حامل ہے۔ ان میں دو اہم کتاب سرفہرست ہے۔ ایک رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ جو بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری کتاب جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' ہے۔ یہ کارنامہ اعلیٰ تحقیقی، تنقیدی معیار، معلومات اور اسلوب بیان کے حوالے سے زندہ جاوید ہے۔